سلسلۂ مطبوعات شرقیہ 1
چلچراغ
ڈاکٹر زاہد منیر عامر
کلیۂ علومِ شرقیہ ○ پنجاب یونیورسٹی ○ لاہور
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

سلسلۂ مطبوعاتِ شرقیہ I

حدِ چراغ

(مجموعۂ مقالات)

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

کلیۂ علومِ شرقیہ

پنجاب یونیورسٹی، لاہور

نام کتاب: چلچراغ (مجموعۂ مقالات)

مصنف: ڈاکٹر زاہد منیر عامر zahidmuniramir@hotmail.com

ناشر: پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر dean.ol@pu.edu.pk

ڈین کلیہ علومِ شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور فون:92-42-9210837

اشاعتِ اوّل: 2007ء حروف بندی: طارق مجید سرورق: عبیداللہ

ضخامت: 304 صفحات مطبع: پنجاب یونیورسٹی پرنٹنگ پریس

اہتمامِ اشاعت: محمد خالد خان، ڈائریکٹر ڈیپارٹمنٹ آف پریس اینڈ پبلی کیشنز پنجاب یونیورسٹی لاہور

قیمت: 150 روپے

Chilchragh, An Anthology of Research Articles, written by: Dr. Zahid Munir Amir, Associate Professor in Urdu, Punjab University Oriental College Lahore. Published by: Prof. Dr. Muhammad Saleem Mazhar, Dean Faculty of Oriental Learnings, University of the Punjab, Allama Iqbal Campus, Lahore. Printed at Punjab University Printing Press in 2007.

ISBN. 978-969-8390-06-8

Can be hand from : Dean Office, Punjab University Oriental College, Allama Iqbal (old) Campus, Alberuni Road, Lahore, 54000 Pakistan.

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کے نام

چو چلچراغِ سخن درمیانہ روشن شد
پرید چلچلہ ہائی ز شاخسارِ سکوت

فہرست

باب دوم:

اسلام اور پاکستان

باب سوم:

مطالعۂ اقبال

باب چہارم:

جہانِ دیگر

حرفِ چند

وطنِ عزیز کی قدیم وعظیم دانش گاہ پنجاب یونیورسٹی کا آغاز اس کے اوّلین ادارے اورینٹل کالج سے ہوا تھا جس کی بنا یوں تو ۱۸۶۵ء میں قائم ہونے والی انجمن پنجاب نے رکھ دی تھی لیکن ایک درس گاہ کے طور پر اس کا تشخص ۱۸۷۰ء میں قائم ہوا، جب مدرسہ علوم مشرقی کا آغاز ہوا...... اس ادارے نے گذشتہ ۱۳۷ سال میں علوم مشرق کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، کشمیریات، ہندی اور سابقہ زمانوں میں سنسکرت، گورمکھی، طب وغیرہ کے شعبوں نے اپنے اپنے میدانوں میں قابل توجہ تحقیقات اور مطبوعات علمی دنیا کے سامنے پیش کیں۔ ۱۹۷۰ء میں اس ادارے کے پہلے سو سال مکمل ہو جانے پر جشنِ صد سالہ منانے کا تخیل ابھرا جس کے نتیجے میں یہاں ۱۲ سے ۱۷ر مارچ ۱۹۷۳ء تک علوم مشرق کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر متعدد کتابیں اور جشن نامے شائع کیے گئے۔ سال اقبال ۱۹۷۷ء کے سلسلہ میں بھی ضخیم جشن نامہ شائع کیا گیا اس سے پہلے انیسویں صدی میں یہاں کے اساتذہ وعلما نے اپنے شعبوں میں متعدد قابل توجہ کتابیں پیش کیں۔ ۱۹۹۵ء میں ادارے کے قیام کے ۱۲۵ سال پورے ہونے کی مناسبت سے بھی متعدد مطبوعات علمی دنیا کے سامنے پیش کی گئیں۔

میرے پیشرو ڈین صاحبان نے تدریسی امور کی طرف بھر پور توجہ دینے کے ساتھ، کلیہ علوم شرقیہ کی تحقیقی سرگرمیوں اور اس سے وابستہ مختلف شعبہ جات کے اساتذہ کے تحقیقی کاموں کو شائع کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا، جس پر اُن کو سلام پیش کرتا ہوں۔

کلیہ علوم ِشرقیہ کے ڈین کا منصب سنبھالنے کے بعد میرے پیش نظر بہت سے کام ہیں جن میں سرِفہرست اس عظیم ادارے کی علمی اور تحقیقی روایت کا فروغ ہے۔

اورینٹل کالج سے ماضی میں سلسلہ مطبوعات شرقیہ اور سلسلہ مطبوعات مجلسِ مخطوطات کے تحت گراں قدر علمی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرز پر یہاں سے علمی مطبوعات کی ایک سیریز شائع کی جائے جو علوم شرقیہ میں استناد کا درجہ رکھتی ہو۔ میرے پیشِ نظر آکسفورڈ یونیورسٹی، کیمبرج یونیورسٹی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور خود اورینٹل کالج کی قائم کردہ عظیم علمی روایات ہیں۔ خوش قسمتی سے اس سلسلے میں ہمیں رئیس الجامعہ کا پورا تعاون اور سرپرستی حاصل ہے، زیرِنظر کتاب کی اشاعت سے مطبوعاتِ شرقیہ کی جس سیریز کا احیا کیا جارہا ہے اس کے لیے سرپرستی، حوصلہ افزائی اور گرانٹ کی فراہمی پر میں محترم وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود صاحب کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

میرے لیے یہ بات دوہری مسرت کا باعث ہے کہ اس عظیم علمی و تحقیقی روایت کا احیا میرے عزیز دوست اور رفیقِ کار ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے مجموعۂ مقالات چلچراغ کی اشاعت سے ہورہا ہے۔ اپنے متنوع موضوعات، موثر اور دلنشین اسلوب کے اعتبار سے یہ ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ صحتِ مطالب اور روشِ تحقیق کے حوالے سے فاضل مصنف نے اس میں اس درخشاں روایت کو فروغ دیا ہے، جس کی بنیاد استاد حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے رکھی تھی۔

ڈاکٹر زاہد نے اس کتاب میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ یہ موضوعات ان کا اوڑھنا بچھونا رہے ہیں۔ اسلام، پاکستان، کلاسیکی ادب، تذکرے، اقبال، ظفر علی خان، اورینٹل کالج، خطوط، شاعری ڈاکٹر زاہد کے لیے موضوعات

نہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی کے متبادل عنوانات ہیں اور کوئی مصنف جب ایسے موضوعات پر قلم اٹھائے جن کے ساتھ اس نے عمر بسر کی ہو تو ایسی تحریروں کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ یوں تو اس کتاب کے تمام مقالے علمی، فکری اور تحقیقی حوالوں سے قابلِ توجہ ہیں لیکن میں یہاں اس کتاب کے دو مقالوں کی طرف بطورِ خاص قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ یہ دو مقالے ''گلشنِ ہند۔ ایک نامکمل اندراج کی تکمیل'' اور ''علامہ اسد اور پنجاب یونیورسٹی۔ وصل و فصل'' اس حوالے سے خاص طور پر قابل توجہ ہیں کہ ان میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت اہم معلومات پہلی بار اہلِ علم کو پیش کی ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ ان موضوعات پر لکھنے والے ان مقالوں سے بے نیاز نہیں ہو سکیں گے یوں گویا یہ مقالے اپنے موضوعات پر ابتدائی ماخذ کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔

چلچراغ ۱۴ مقالات پر مشتمل ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی بیسویں مستقل کتاب ہے۔ میری طرح ایران میں تعلیم حاصل کرنے والے کسی بھی طالب علم کے لیے بیس کا عدد ایک خاص جاذبیت اور دلکشی کا حامل ہے کیونکہ وہاں امتحان کے سو نہیں بیس نمبر ہوتے ہیں اور اس عدد کے ساتھ عروج و کمال (Perfection) کا تصور ابھرتا ہے، جو میرے نزدیک ''چلچراغ'' پر بھی صادق آتا ہے۔

زاہد صاحب جامع کمالات شخص ہیں، انھوں نے اگرچہ بیشتر عمیق موضوعات پر قلم اٹھایا اور اپنی تصنیفات میں معیار کے حوالے سے بھرپور عدل کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری بھی کی اور اس ہنر میں بھی داد و تحسین پائی۔ ان کی ۱۹۹۱ء میں کہی گئی بعض نظموں کا تو میں پہلا سامع ہوں اور دوست ہونے کے ناتے شان نزول کا خبردار بھی۔

انھوں نے جہاں ''مکاتیبِ ظفر علی خان''، ''تاریخِ جامعہ پنجاب''، ''چار موسم ایچی سن کالج میں''، ''کلیاتِ میر سوز''، ''جہات''، ''آئینہء کردار''، ''نقوشِ جاوداں'' اور

''علامہ اقبال کی تاریخ ولادت......ایک مطالعہ'' جیسی بھرپور تحقیقی کتب دانش دوست حلقوں کو پیش کیں وہیں نوجوان نسل کے فکری اور جذباتی مسائل کا ''لمحوں کا قرض'' کے عنوان سے تجزیہ کیا اور یہ تجزیہ حیران کن حد تک حقیقی، بھرپور اور جامع ہے۔ حیران کن اس لیے کہ ان کی طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کے مشاغل و مصروفیات پر نظر ڈالیں تو تعلیم، تحقیق و جستجو، اساتذہ، کتب خانوں، سیمینارز، کانفرنسوں اور ٹی وی، ریڈیو کے علمی لیکچرز اُن کی سرگرمیوں کا محور و مرکز نظر آئے ہیں اور یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچپن سے چھلانگ لگا کر علمی پیرانہ سالی تک جا پہنچے۔ ثبوت کے طور پر ۱۹۸۶ء میں محض بیس سال کی عمر میں تالیف کی گئی ''مکاتیب ظفر علی خان'' جیسی وقیع وثقہ کتاب پیش کی جا سکتی ہے۔ (اور یہ ان کی تیسری کتاب تھی)

جواں سالی میں اعلیٰ پایہ کا کثیر علمی و تحقیقی کام بغیر تعہد (Committment) لگن (Devotion) اور توفیق (Blessing) کے ممکن ہی نہیں:

این سعادت بہ زور بازو نیست
تا نبخشد خدای بخشندہ

اور زاہد صاحب کی خوش نصیبی کہ اُن کو یہ سب سعادتیں میسر ہیں، ان کے علمی کارناموں اور تحقیقی معرکوں پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کی مزید کامیابیوں اور سرافرازیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

آخر میں ڈائریکٹر ڈیپارٹمنٹ آف پرنٹنگ اینڈ پبلی کیشنز، محمد خالد خان صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی توجہ سے اس کتاب نے طباعت و اشاعت کے مراحل طے کیے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر
ڈین
کلیۂ علوم شرقیہ

چراغوں سے پہلے

به نامِ آن که جان را فکرت آموخت
چراغِ دل به نورِ جان برافروخت
زفضلش هر دو عالم گشت روشن
زفیضش خاکِ آدم گشت گلشن

چلچراغ، چہل چراغ کا مختصر روپ ہے جس کا مطلب چالیس چراغ یا فانوس لیا جاتا ہے اس مجموعے کے لیے یہ نام منتخب کرنے کی وجہ وہ رنگارنگی ہے جو اس مجموعے کے مضامین میں پائی جاتی ہے، یوں بھی تحقیق چراغ جلانے کا عمل ہے جو وقت کی گرد میں گم ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو جانے والے حقائق کو روشن کرتا ہے۔ اس چراغ سے مزید چراغ روشن ہوتے ہیں یوں کارِ تحقیق، اجالوں کے سفر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

چلتچراغ ناچیز مرتب کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے (میرے محترم دوست ڈاکٹر محمد سلیم مظہر صاحب انھیں مقالات کہنے پر مصر ہیں) پہلا مجموعہ ''جہات'' سات برس قبل پنجاب یونیورسٹی ہی نے شائع کیا تھا۔ زیرِ نظر مجموعے میں شامل مضامین کا زمانی دائرہ گزشتہ بیس برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پہلے مجموعے کے مضامین کی طرح یہ مضامین بھی دراصل راقم کی دلچسپیوں اور بیتے برسوں میں اس کی سرگرمیوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ مضمون نگاری کی تحریک خارجی بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے ثمر کی شیرینی مضمون نگار کے داخل کی دنیا سے روشنی کشید کیے بغیر ممکن نہیں۔ یہ مضامین اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں اس کا بہتر فیصلہ تو خوانندگانِ کرام ہی کر سکتے ہیں، یہاں ان مضامین کے پس منظر کو روشن کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مجموعے کے دو مضامین ''گلشنِ ہند...... ایک نامکمل اندراج کی تکمیل'' اور ''علامہ اسد اور پنجاب یونیورسٹی'' بالکل تازہ اور غیر مطبوعہ ہیں اور حقائق کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کی خواہش کے تحت لکھے گئے ہیں۔ مقالہ نگاری سے متعلق مضمون پنجاب یونیورسٹی کے بورڈ آف سٹڈیز اُردو کے مطالبے پر لکھا گیا تھا، بورڈ نے مقالہ نگاری کا یکساں طریقِ کار متعین کرنے کے لیے ایسی تحریر کا مطالبہ کیا تھا، اس مضمون کی صورت میں کی گئی تعمیل کو بورڈ نے یونیورسٹی میں لکھے جانے والے مقالات کے لیے منظور کیا۔ اورینٹل کالج کو ماضی کے دریچے سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب اس تاریخی ادارے نے اپنی زندگی کے ایک سو پچیس سال مکمل کیے، یہ مضمون اس موقع پر ادارے کی طرف سے شائع کیے جانے والے ایک مجموعے میں شامل کیا گیا تھا۔ میر سوز سے راقم کے علمی تعلق کی عمر اب سولہ برس ہو چکی ہے، راقم نے اٹھارویں صدی کے اس اہم شاعر کے شعری کلیات کی

تدوین کی تھی جس پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی۔زیرِ نظر کتاب میں میر سوز سے متعلق پیش کی جانے والی تحقیقات بالکل جدا ہیں اور راقم کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کا حصہ نہیں ہیں۔مولانا ظفر علی خان کے سرمایہء گفتار کی تحقیق دو عشرے قبل کی گئی تھی، یہ مضمون اس کے بہت بعد رسالہ اقبال کے ادبیات اردو نمبر میں اشاعت پذیر ہوا لیکن اب مضمون کا جو رُوپ اس کتاب میں شامل ہے بالکل نیا ہے اور پرانے اور نئے مضمون میں ایک جزو کے سوا اتنا تعلق رہ گیا ہے کہ دونوں ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں۔ایک نایاب نظم کی دریافت سالِ ظفر علی خان (۲۰۰۶ء) کا تحفہ ہے۔اسلام اور پاکستان کے حصے میں شامل پہلا مضمون ایک رسالے کے مدیر کی طرف سے آنے والے سوال کے جواب کے طور پر لکھا گیا جب کہ دوسرا مضمون بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک سیمے نار میں پیش کیا گیا تھا اور اسلامی یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیے جانے والے اس سیمے نار کے مجموعہء مقالات میں شائع ہوا۔

علامہ اقبال سے متعلق جو مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں وہ اس زمانے کے ہیں جب اقبال کی نگاہِ التفات مضمون نگار پر گوشہ گوشہ کھل رہی تھی۔عصرِ حاضر کے مسائل اور فکرِ اقبال پنجاب پبلک لائبریری لاہور کے اسی عنوان سے منعقد ہونے والے ایک سیمے نار میں پڑھا گیا، اسلام کا انقلابی تصور اور اقبال ایک بزرگ دانش ور کے جواب میں لکھا گیا (صراحت مضمون میں موجود ہے) اقبال آج کا فن کار اور مطالباتِ فن، اپنے ماحول میں موجود باصلاحیت نوجوانوں کی راہ نمائی کے خیال سے سپردِ قلم کیا گیا تھا۔ خطوطِ مشاہیر کا ذخیرہ، خطوط کے اس نادر ذخیرے کی سیر کا لازمی نتیجہ تھا، اس ذخیرۂ خطوط تک رسائی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے توسط سے حاصل ہوئی، جس پر راقم ان کا ممنون ہے۔آخری مضمون

محترمہ پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا جسے انھوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''مرقع صدیقی'' میں شامل کیا۔ یہ مضامین کم و بیش اپنی اصل صورت میں ہیں البتہ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی قلم لگا دینے میں مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ خاص طور سے مقالہ نگاری، مولانا ظفر علی خان، میر سوز اور اورینٹل کالج والے مضامین میں معتد بہ اضافے کر دیے گئے ہیں، امید ہے کہ اپنی موجودہ صورت میں یہ مضامین زیادہ مفید ہو سکیں گے۔

اورینٹل کالج اور کلیہ علومِ شرقیہ علمی تحقیق کی ایک تابناک روایت کے حامل ہیں، میرے محترم دوست پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر صاحب نے ڈین آف فیکلٹی کا منصب سنبھالا تو انھوں نے اس فیکلٹی کی علمی روایت کو زندہ کرنے کا عزم کیا۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے راقم کی زیرِ نظر کتاب کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا، اس لیے اس کتاب میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ اس کتاب کے محرک ڈاکٹر محمد سلیم مظہر صاحب کی طرف منسوب کی جانی چاہیے اور خرابیوں کی اطلاع و اصلاح کے لیے ناچیز مرتب کا دل اور دامن ہمیشہ کی طرح کشادہ ہے۔

زاہد منیر عامر

ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردو

پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور

جلچراغ

تحقیق و تجزیہ

مقالہ نگاری

طریق کار اور ضوابط

تحقیق قوموں اور معاشروں کی مزاج پیما ہوتی ہے۔ یہ مکتبی اصطلاح کا نہیں بلکہ زندگی گزارنے کے ایک رویّے کا نام ہے۔ اگر آپ کسی قوم کی اخلاقی اور علمی صورتِ حال کا اندازہ لگانا چاہتے ہوں تو معاشرے میں تحقیق کی صورتِ حال کو دیکھ لیجیے۔ اگر تحقیق میں شیر مرد نظر آئیں تو جان لیجیے کہ قوم زندہ اور اس کے اخلاقی و علمی معیار بلند ہیں...... اگر بیشۂ تحقیق شیر مردوں سے خالی ہو تو اس میں شبہ نہیں رہنا چاہیے کہ معاشرہ اپنی نظر کھو کر کور بصری اور جمود کے حلقے اپنی گردن میں ڈال چکا ہے۔

تحقیق ایک مسلسل عمل کا نام ہے لیکن نو واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے بسا اوقات یہ سوال بہت پریشان کُن بن جاتا ہے کہ کس موضوع پر تحقیق کی جائے......؟ وہ جس موضوع پر تحقیق کا ارادہ کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس پر پہلے تحقیق ہو چکی ہے۔ جس سے وہ

دل شکستگی کا شکار ہوتے ہیں اور بعض اوقات خیال کرنے لگتے ہیں کہ تمام موضوعات پر تحقیق ہو چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موضوع کا تعلق خارج سے کم محقق کے داخل اور اس کی زندگی کی بنیادی دلچسپیوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ بہترین موضوع وہ ہوتا ہے جو تحقیق کار کے باطن سے جنم لے، اسے اساتذہ کی راہ نمائی سے چمکایا جا سکتا ہے۔ نیا موضوع تلاش کرنا دشوار نہیں بلکہ تحقیق شدہ موضوعات کے بھی ایسے پہلو دریافت کیے جا سکتے ہیں جن پر پہلے محققین کی نگاہ نہیں پڑی لیکن اس کے لیے تحقیق کار میں کچھ صفات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ اُسے علمی و تہذیبی روایت سے دلچسپی ہو، وہ اس کے تحفظ کی اہمیت سے واقف ہو، اس پر تنقید کر سکتا ہو اور اس کے لیے موسیقی کی اصطلاح میں ضروری 'ریاض' کر سکے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی طبیعت میں 'موجود' سے بے اطمینانی ہو اور وہ نا منکشف دنیاؤں کا جویا ہو۔ محض تحقیق شدہ موضوعات پر کام سے وقت، صلاحیت اور توانائی کا ضیاع ہوتا ہے۔

تحقیق کار کو موضوع کا انتخاب کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ؎

بھلا تردّدِ بے جا سے ان میں کیا حاصل

اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

ادب کی دنیا بے حد وسیع ہے، افکار، رجحانات، تحریکات، شخصیات کے کتنے ہی پہلو ہیں جن پر تحقیق ہو سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر وہ متون ہماری توجہ چاہتے ہیں، جو ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں، اس لیے کہ ادب کی صحیح تاریخ اور تنقید، فکری و تہذیبی رویّوں کی شناخت، درست متون کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اردو ادب میں خاص طور پر کلاسیکی شعری و نثری متون کا حال بہت قابلِ توجہ بلکہ قابلِ رحم ہے۔ چند ایک انگشت شمار کلاسیکی اساتذہ کو چھوڑ کر

اکثر و بیشتر کے متون توجہ اور تحقیق چاہتے ہیں لیکن آج کے آسان کوش اور عاجل تحقیق کار اس کھکھیڑ میں نہیں پڑتے وہ کسی ایسے موضوع پر کام کرنا چاہتے ہیں جس میں زحمت نہ ہو۔ دور دراز اسفار کی مشقت نہ ہو، آنکھوں کا لہو نہ ٹپکے اور کام جلد از جلد مکمل ہو کر ڈگری مل جانے کی راہ کھل جائے...... ڈگری! جس سے کچھ پیشہ ورانہ ترقی اور کچھ مالی مفادات وابستہ ہو چکے ہیں، لیکن تحقیق کا ثمر جو بھی ہو، تحقیق آسان کوشی کی ان شرائط پر کبھی پوری نہیں اُترتی۔ اس کے لیے اپنے آرام وسکون کی قربانی دینا پڑتی ہے، موضوع کو اپنے اوپر طاری کرنا ہوتا ہے۔ کام چلانے کے خیال کو ترک کر کے کام بنانے کا خیال راسخ کرنا ہوتا ہے۔

اگر تحقیق کار یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو تو پھر اسے تحقیق کے میدان میں اترنا چاہیے اور ان شرائط کے ساتھ میدان تحقیق میں اترنے والوں کے لیے۔

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

ہمارے معاشرے میں تحقیق کی روایت جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر لکھے جانے والے مکتبی ضرورت کے مقالات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے چونکہ ان مدارج سے پہلے تحقیق کاروں کو بالعموم مقالہ نگاری کا تجربہ نہیں ہوتا، اس لیے وہ اس راہ میں چند در چند دشواریوں کا شکار رہتے ہیں۔

مرکزی سطح پر مختلف اداروں میں ہونے والے تحقیقی کام کے تبادلے یا اس سے متعلق باہمی اطلاع رسانی کا کوئی نظم نہ ہونے کے باعث موضوعات میں در آنے والی یکسانی اور تکرار اس پر مستزاد ہے۔ چنانچہ مقالہ نگار طلبا و طالبات جب وادیِ تحقیق میں داخل ہوتے ہیں تو راہ ومنزل کی اجنبیت ان کے لیے حوصلہ شکنی کا سامان کیا کرتی ہے۔

اس صورت حال کے پیشِ نظر آئندہ اوراق میں مقالہ نگاری سے متعلق کچھ عملی نکات پیش کیے جا رہے ہیں۔

موضوع کا انتخاب

مقالہ نگاری کا پہلا مرحلہ موضوع کا انتخاب ہے، یہ پہلا ہی نہیں اہم ترین مرحلہ بھی ہے، درست موضوع کا انتخاب تحقیق کے سفر میں پہلی کامیابی ہے۔ اگر تحقیق کار خود سے واقف ہے اور اپنی صلاحیت کو پہچانتا ہے تو وہ اپنے لیے بہتر موضوع کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اگر زندگی دوسروں کی نگاہوں سے دیکھے ہوئے مناظر پر منحصر ہو تو ظاہر ہے کہ موضوع کا انتخاب بھی دوسروں کا مرہونِ منت ہوگا، اچھا موضوع وہ ہے جو تحقیق کار نے خود منتخب کیا ہو اور جس سے اس کی شخصی وابستگی ہو۔ موضوع کا انتخاب کرتے ہوئے ذیل کے امور کو مدِ نظر رکھا جائے:

۱۔ مقالات کی فہرستیں دیکھ کر معلوم کیا جائے کہ کن موضوعات پر تحقیق ہو چکی ہے اور اب کن موضوعات پر تحقیق کی ضرورت یا گنجائش ہے۔

۲۔ مقالہ نگار جس شعبہء ادب سے دلچسپی رکھتا ہو، اس سے متعلق موضوع اختیار کرنا مناسب ہوگا، مثلاً شاعری (یا اس کی کوئی صنف، غزل، رباعی، قصیدہ، نظم، آزاد نظم وغیرہ) ناول، افسانہ، ڈراما، انشائیہ، آپ بیتی، سفرنامہ، خاکہ، طنز و مزاح، تنقید، تحقیق، تاریخ ادب (کوئی دور، یا بعض رجحانات، تحریکیں وغیرہ)۔

۳۔ مقالہ نگار کی صلاحیت کیا ہے! انگریزی، فارسی، عربی سے مناسب واقفیت ہے یا نہیں......؟ اگر موضوع کا تعلق شاعری سے ہے تو کیا وہ وزن اور عروض کا شعور رکھتا ہے......؟

۴۔ مقالہ نگار، تحقیقی کام کے لیے کتنا وقت نکال سکتا ہے، اپنے شہر یا دوسرے قریبی یا دور دراز واقع شہروں کے کتب خانوں، اساتذہ اور علمی و ادبی شخصیات سے رجوع کے لیے وہ سفر کر سکتا ہے یا نہیں......؟ اس کے وسائل کیسے ہیں اور وہ کس قدر مشقت کر سکتا ہے......؟

۵۔ مقالہ لکھنے کے لیے کتنی مدّت میسر ہے......؟

۶۔ تحقیق جلد بازی کو گوارا نہیں کرتی ، ہو سکے تو پہلے مرحلے میں ایک سے زائد موضوعات کا انتخاب کیا جائے پھر ان پر غور اور مشورے کے بعد' ان سے متعلق مواد اور لوازمے کی دستیابی یا مآخذ تک رسائی کے امکانات کا جائزہ لیا جائے' اس کے بعد اپنے مزاج کے مطابق بہتر موضوع انتخاب کیا جائے' خواہ چند روز یا چند ہفتے توقّف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

۷۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رکھی جائے کہ تحقیق اور تنقید دو ایسے علاقے نہیں ہیں جن میں ایک دوسرے کی آمد و رفت ممنوع ہو بلکہ تحقیق ،تنقیدی بصیرت اور تنقید، تحقیقی مزاج کو پیدا کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ اگر تحقیق کے بغیر تنقید بے کار ہے تو تنقیدی نظر کے بغیر تحقیق بھی ایک بے نتیجہ سرگرمی بن کر رہ جاتی ہے، اس لیے موضوع، جو بھی انتخاب کیا جائے' اس پر کام کرتے ہوئے تحقیق اور تنقید کے دھارے برابر بہنے چاہییں۔

مواد/لوازمے کی فراہمی

مواد کی فراہمی ایک صبر آزما عمل ہے، ابتدا میں پیش آنے والی ناکامیوں سے گھبرا جانا تحقیق کار کی منزل کھوٹی کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس راہ میں ثابت قدم رہے تو رفتہ رفتہ راستے کھل جاتے ہیں، لیکن اس مرحلے میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تحقیق کا مقصد کباڑ خانہ

بنانا نہیں بلکہ گل چینی کرنا ہے۔ایسی گل چینی جو عطر بیز نتائج کی حامل ہو۔فراہم ہو جانے والا تمام مواد اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے ضرور مقالہ میں سمو دیا جائے بلکہ اس میں سے کڑا انتخاب کر لینا چاہیے اور زائد مواد کو تحقیقی منصوبے کی تکمیل کے بعد کسی جزوی موضوع کی تکمیل کا ذریعہ بنا لینا چاہیے۔

تلاش و جستجو کرتے ہوئے مآخذ کی فہرست بنا لینی چاہیے۔مختلف جامعاتی، عوامی اور شخصی کتب خانوں سے رجوع کر کے یہ معلوم کر لیا جائے کہ کسی خاص موضوع پر، کس کتب خانے یا شخصی ذخیرۂ کتب و رسائل میں لوازمہ ملنے کی زیادہ توقع ہے۔پھر مختلف اصحاب اور ماہرین سے ملاقاتیں (انٹرویو) کر کے معلومات جمع کی جائیں۔تحقیق کار کو علما سے رجوع کرنے سے قبل موضوع کے بارے میں ضروری آگہی حاصل کر لینی چاہیے۔ممکن ہو تو بہت ضروری کتابیں (اور رسائل وغیرہ) خود خرید لی جائیں۔بعض کتب و رسائل سے فوٹو کاپی بنوانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ایسے مواقع پر متعلقہ مآخذ کا پورا حوالہ، اسی وقت نوٹ کر لینا انتہائی ضروری ہے۔

جو مواد / لوازمہ جمع ہو جائے بہ غور اس کا مطالعہ کر کے یادداشتیں یا نوٹس لیتے جائیے......اخذ و انتخاب میں غور اور احتیاط ضروری ہے۔صرف ضروری نکات (مع حوالہ) نوٹ کیے جائیں۔لمبے اقتباسات نقل کرنا ضروری نہیں، ان کا مفہوم یا خلاصہ لکھ لینا چاہیے......یہ کام توجہ، یکسوئی اور محنت سے جلد مکمل کر لینا چاہیے۔

خاکے کی تیاری

جس طرح ایک ماہر معمار تعمیر سے پہلے نقشہ تیار کرتا ہے اسی طرح تحقیق کار کو چاہیے کہ وہ مقالے سے پہلے اس کا خاکہ تیار کرے۔نقشے کے بغیر تیار کی جانے والی

عمارت بے سروپا اور حسنِ تناسب سے محروم ہو سکتی ہے۔ تحقیق کار اگر یہ چاہتا ہے کہ اُس کی محنت حسنِ تناسب سے آراستہ اور نک سک سے درست ہو تو اُسے کام سے پہلے اُس کا خاکہ ضرور بنانا چاہیے۔

ابتدائی طور پر، مباحث کو مختلف عنوانات دے کر تبویب (ابواب بندی) کرنا مفید ہوگا۔ مباحث کے عنوانات کے تعیّن اور خاکے کی تیاری میں، اچھے مقالات (Thesis/Desertations) کو نمونے کے طور پر دیکھنا مفید رہے گا۔ تاہم یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ ہر موضوع کے اپنے مطالبات ہوتے ہیں، کسی ایک موضوع کا خاکہ بتمام و کمال دوسرے موضوع کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔

تحریر و ترتیب

تحریری کام، مقدمے/ابتدائیے کے سوا خاکے کے مطابق ترتیب سے کیا جائے تو بہتر ہے لیکن اگر اس وقت مصادر و مراجع پوری طرح دسترس میں نہ ہوں تو پھر کسی بھی باب سے آغاز ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں، مقالہ مکمل ہونے پر، تمام حصّوں کو باہم مربوط کرنا ضروری ہوگا۔ جب تحریری کام شروع ہو تو ابتدا میں چند صفحات لکھ کر، نگرانِ مقالہ کو دکھا لیے جائیں۔ مقالہ لکھتے وقت جملہ مصادر و مراجع سامنے رکھنے چاہییں، دورانِ مطالعہ جمع کی گئی یادداشتوں سے بھرپور مدد لی جائے۔ ان کی روشنی میں، حسبِ ضرورت مسوّدے میں ترمیم و تنسیخ کی جائے۔ مقالے کا معیار بہتر بنانے کے لیے نظرِ ثانی اور تنسیخ کا عمل از بس ضروری ہے۔ مقالہ نگار کو نگران کی ہدایات کے مطابق مسودے میں بار بار کاٹ چھانٹ کرنے میں کوئی تامّل نہیں کرنا چاہیے، اس سے آئندہ ابواب تحریر کرنے میں آسانی ہوگی۔ بڑے فن کاروں کے مسودات ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھی تحریر کے لیے کتنی بار

ترمیم و تنسیخ کے عمل سے گزرا جاتا ہے۔ دلِ گداختہ اور ریاضِ مسلسل ہی کے ذریعے حسنِ فروغِ شمعِ سُخن کی منزل کو پایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال کی بیاضیں ملاحظہ کرنی چاہییں جنھیں دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فن کار اپنی تخلیق کو وقت کی عدالت میں پیش کرنے سے پہلے اُس پر کتنی محنت کرتا ہے۔ مقالہ نگار کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے:

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مردِ ہنر مند ہے آزاد

مآخذ

مآخذ سے مراد وہ ذرائع، کتب، مقالات، مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد ہے، تحقیق کار اپنی تحقیق کے دوران میں جن سے رجوع کرتا ہے۔ تحقیق کی دنیا میں مآخذ کی بہت اہمیت ہے کہ ان کے ذریعے حقائقِ اشیا کو ان کے اصل رُوپ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حقائقِ اشیا کی دریافت کا مقصد اپنی نظر پیدا کرنا ہے۔ اگر محض مآخذ سے حاصل ہونے والی معلومات کو دہرا دیا جائے تو تحقیق کے تکرارِ محض بن جانے کا اندیشہ ہے۔ مآخذ سے حاصل ہونے والی معلومات کو تجزیے کے عمل سے گزارنا ازبس ضروری ہے۔ اصطلاح میں مآخذ سے مراد وہ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مواد ہے جس سے اخذ و استفادہ کے ذریعے مقالہ نگار اپنے موضوع سے متعلق نتائج مرتب کرتا ہے۔

مآخذ دو قسم کے ہوتے ہیں:

ا۔ بنیادی مآخذ (Primary Sources)

کسی موضوع سے متعلق براہِ راست معلومات فراہم کرنے والی کتب، مقالات، روزنامچے، دستاویزات، مخطوطات اور خطبات وغیرہ مثلاً ایک واقعے کے عینی شاہد کا بیان،

خواہ تحریری کی شکل میں ہو یا تقریری صورت میں، اس واقعے سے متعلق تحقیق کا بنیادی ماخذ کہلائے گا۔ بنیادی ماخذ کو مصادر بھی کہتے ہیں۔

۲۔ ثانوی ماخذ (Secondary Sources)

کسی موضوع سے متعلق بالواسطہ معلومات فراہم کرنے والی کتب، مقالات اور دیگر تحریریں، ان میں بنیادی ماخذ سے استفادہ کر کے لکھی جانے والی تحریریں اور تراجم وغیرہ بھی شامل ہیں، ایسی تحریروں کو مراجع بھی کہا جاتا ہے۔

مقالہ نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو بنیادی ماخذ کی بنا پر استوار کرے اور جہاں تک ممکن ہو ثانوی ماخذ پر انحصار نہ کیا جائے، جہاں ثانوی ماخذ کا ذکر ضروری ہو وہاں اس کا موازنہ بنیادی ماخذ سے کر لیا جائے، بصورتِ دیگر نقل در نقل کا وہ سلسلہ چل نکلتا ہے جس سے حقائق مجروح ہوتے ہیں۔

جہاں کسی ثانوی ماخذ سے استفادہ ناگزیر ہو وہاں بنیادی ماخذ کے حوالے کے ساتھ 'بحوالہ'' لکھ کر ثانوی ماخذ کا ذکر کرنا تحقیق کی اخلاقیات کا بنیادی تقاضا ہے۔

حوالے دینے کا طریق کار

مقالے میں حوالوں کے لیے پاورق (فٹ نوٹ) میں حوالہ دینے، باب کے آخر میں حوالہ دینے، یا مقالے کے آخر میں حوالہ دینے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ یہاں مقالہ نگاروں سے متعلقہ صفحہ کے نیچے یعنی پاورق میں حوالہ دینے کی سفارش کی جاتی ہے، اگر اس میں فنی مشکلات حائل ہوں تو پھر ہر باب کے آخر میں اس باب کے حوالے درج کیے جانے چاہئیں، آج کل یہی طریقِ کار رائج ہے۔

آئندہ سطور میں مختلف ماخذ کی نشاندہی کے طریقِ کار کی وضاحت کی جا رہی ہے:

۱۔ مستقل تصنیف کا حوالہ

۱۔ مصنف کا نام (پہلے نام کا معروف ترین حصہ لکھا جائے اور بعدازاں نام کا بقیہ حصہ)

۲۔ کتاب کا نام

۳۔ مقام اشاعت (یعنی کتاب جس شہر سے شائع ہوئی)

۴۔ شائع کرنے والے ادارے کا نام

۵۔ کتاب کا سنہ اشاعت (اگر سنہ اشاعت درج نہ ہو تو سنہ ندارد کا اختصار ''س۔ن'' لکھا جائے)

۶۔ کتاب کی جلد یا حصّہ

۷۔ کتاب کا متعلقہ صفحہ نمبر یا صفحات

مثال: جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۹ء جلد اول، ص ۹۲

۲۔ ترجمہ کی گئی یا مدوّن / مرتّب کی گئی کتاب کا حوالہ

۱۔ مصنف کا نام ۲۔ کتاب کا نام ۳۔ مترجم / مرتب / مدون کا نام ۴۔ شہر کا نام ۵۔ مطبع / ناشر کا نام ۶۔ سنہ اشاعت ۷۔ جلد ۸۔ صفحہ نمبر

مثال:

ناصر، سعادت خان: خوش معرکہء زیبا، مرتبہ: مشفق خواجہ، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۲، جلد اوّل ص ۲۰۷

میر تقی میر: ذکر میر، مترجمہ و مرتبہ: نثار احمد فاروقی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۶ء، ص ۷۰۔

۳۔ مجموعہءمقالات کا حوالہ

۱۔مقالے کے مصنف کا نام ۲۔مقالے کا عنوان ۳۔مجموعہءمقالات کا نام

۴۔مجموعہء مقالات کے مرتب / مدون کا نام ۵۔ شہر کا نام ۶۔ مطبع /ناشر

۷۔سنہ اشاعت ۸۔جلد ۹۔صفحہ نمبر

مثال:

غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر :اردواملا کی تاریخ، مشمولہ منتخب مقالات اردو املا و رموز اوقاف مرتبہ :ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۔

۴۔ رسالوں میں چھپنے والے مقالات / مضامین کا حوالہ

شیرانی، حافظ محمود خان: رباعی کے اوزان یادرکھنے کا ایک آسان طریقہ، قسط اول در اوری اینٹل کالج میگزین، ایڈیٹر محمد شفیع، لاہور: یونیورسٹی اوری اینٹل کالج جلد ۱۶۔شمارہ ۲ عدد مسلسل ۶۰، (فروری ۱۹۴۰ء) ص ۱۷۔

۵۔ لغات اور دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کا حوالہ

لغت کی صورت میں لغت کے مولف کا نام، لغت کا نام، جلد نمبر، ناشر، سنہ اشاعت درج کردینا چاہیے۔دائرۃ المعارف کے حوالے کے لیے:

۱۔مقالہ نگار کا نام ۲۔مقالے کا عنوان / موضوع ۳۔دائرۃ المعارف کا نام

۴۔دائرۃ المعارف شائع کرنے والے ادارے کا نام، ایڈیشن، جلد اور صفحہ نمبر۔

مثال: سید عبداللہ، ڈاکٹر :علم کے عقلی تصورات، در: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور: دانش گاہ پنجاب، طبع اول، جلد ۱۳، ص ۴۵۹۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دائرۃ المعارف میں صفحہ نمبر دینے کی ضرورت

نہیں، اس خیال کا سبب یہ ہے کہ دائرۃ المعارف، لغات کی طرح الفبائی ترتیب سے مرتب کیے جاتے ہیں اس لیے محض عنوان کی مدد سے بھی متعلقہ جگہ تلاش کی جا سکتی ہے، یہ بات اصولاً درست ہے لیکن ہمارے پیشِ نظر یہ خیال ہے کہ بعض اوقات دائرۃ المعارف کا ایک اندراج بھی بہت طویل ہوتا ہے، اس لیے اگر صفحہ نمبر بھی لکھ دیا جائے تو قاری کے لیے سہولت کا باعث ہوگا۔

۶۔ غیر مطبوعہ تحریروں کا حوالہ

ا۔ مخطوطات:

قدیم قلمی کتابوں / مخطوطات کے حوالے کے لیے: مصنف کا نام، مخطوطے کا عنوان، سنہ کتابت، ورق نمبر اور اس ذخیرے کا نام اور اندراج نمبر درج ہوگا جہاں وہ مخطوطہ محفوظ ہے۔

مثال: سوز، سید محمد میر دیوان میر سوز مکتوبہ ۱۲۷۹ھ ورق ۳۵۔ مخزونہ: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اینڈ سولائزیشن، کوالالمپور (ملائیشیا) شمار ۳۴۶

۲۔ تحقیقی مقالات:

تعلیمی اداروں میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کا حوالہ مستقل تصنیف کی طرح دیا جائے گا البتہ ناشر کی جگہ اس شعبے اور تعلیمی ادارے کا نام لکھا جائے گا جس کے زیرِ اہتمام یہ تحقیق مکمل ہوئی اور سنہ اشاعت کی جگہ اس مقالے کی منظوری کا سال اور اس کے بعد متعلقہ لائبریری میں اس مقالے کا اندراج نمبر / کیٹلاگ نمبر اور پھر صفحہ نمبر۔

۳۔ خطوط اور انٹرویوز کا حوالہ

مطبوعہ خطوط کا حوالہ مجموعہ مقالات میں شامل کسی مقالے کی طرح دیا جائے گا۔

غیر مطبوعہ خطوط کے لیے مکتوب نگار کا نام، مکتوب الیہ کا نام (بنام)، جہاں سے خط لکھا گیا اور خط لکھنے کی تاریخ۔ اگر معلوم ہو تو اس ذخیرے کا ذکر بھی کیا جائے جہاں یہ خط محفوظ ہو۔

مثال: مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، علی گڑھ: ۴ دسمبر ۱۹۹۴ء

۴۔ کارروائیاں

اجلاسوں کی رودادوں وغیرہ کے لیے، ادارے کا نام، متعلقہ اجلاس کا موضوع مقام اور تاریخ درج کرنے ضروری ہیں۔

روداد اجلاس ہوم ڈیپارٹمنٹ، لاہور: مئی ۱۸۸۶ء (مخزونہ پنجاب آرکائیوز، لاہور)

روداد اجلاس اساتذہ شعبہء اُردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور منعقدہ ۵ر جولائی ۲۰۰۷ء صفحہ

حواشی اور ضمیمے

متن میں مذکور حوالہ طلب باتوں کی سند فراہم کرنا یا کسی ضمنی مسئلے کی وضاحت کرنا محقق کی ذمہ داری ہے، حوالہ طلب امور کی سند فراہم کرنے کے لیے پاورق (فٹ نوٹ) میں جو حوالہ دیا جاتا ہے اسے استنادی حاشیہ اور کسی ضمنی مسئلے کی پاورق میں کی جانے والی وضاحت کو توضیحی حاشیہ کہا جاتا ہے۔

مختصر توضیحی حواشی جو متن میں مذکور کسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوں، استنادی حواشی میں شامل کر کے لکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ ایسے امور / نکات جن کے بارے میں زیادہ وضاحت کی ضرورت ہو انھیں حواشی میں درج کرنے کی بجائے الگ نوٹ کی شکل میں لکھا جائے اور متعلقہ باب کے آخر میں تعلیقات یا ملحقات کے عنوان کے تحت درج کیا جائے۔

متن کے مطالب سے مربوط فہرستوں یا جزوی مباحث یا دستاویزات کے لیے مقالے کے

آخر میں ضمیمہ یا ضمیمے بھی بنائے جا سکتے ہیں۔

نوٹ: حوالوں میں درج کی جانے والی قیاسی معلومات قلابین (کھڑے بریکٹ) میں سوالیہ نشان کے ساتھ درج کی جائیں، مثلاً [۱۹۸۳ء؟] اور جہاں قیاس بھی کام نہ دے سکے وہاں صراحت کے ساتھ نا معلوم لکھا جائے مثلاً مصنف نامعلوم، مقام اشاعت نامعلوم وغیرہ، سنہ ندارد کے اختصار (س۔ن) کی طرح ان کے لیے بھی مختلف اختصار استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

کتابیات:

کتابیات سے مراد ان تمام مصادر و مراجع کی فہرست ہے جن سے مقالہ نگار نے اپنی تحقیق کے دوران کسی بھی درجے میں استفادہ کیا ہو، کتابیات کی فہرست کو مصنف وار الف بائی ترتیب سے لکھا جائے اور ذیل کے حصوں میں الگ الگ تقسیم کر دیا جائے۔

کتب: اردو، عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ

رسائل واخبارات: اردو، انگریزی وغیرہ

غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات، مخطوطات، بیاضیں، روزنامچے، کارروائیاں وغیرہ۔

خطوط: ملاقاتیں/انٹرویوز

کتابیات کی ترتیب کی ایک شکل

کتب اردو:

ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر: اسلامی تصوف اور اقبال لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء۔

باقر، ڈاکٹر محمد: شرح بانگ درا لاہور، تاج بک ڈپو، ۱۹۵۱ء۔

رشید حسن خان (مرتب) مثنویات شوق از نواب مرزا شوق لکھنوی، دہلی:
انجمن ترقی اردو ۱۹۹۸ء۔

عرشی، مولانا امتیاز علی خاں (مرتب) دستور الفصاحت از احد علی خان یکتا
رام پور: ہندوستان پریس ۱۹۴۳ء

مظفر علی سید، تنقید کی آزادی، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۹۶ء۔

منصوبہ بندی کمیشن حکومت پاکستان، دوسرا پنج سالہ منصوبہ ۶۵۔
۱۹۶۰ء اور اس کی کامیابیاں - آخری جائزہ، کراچی: منصوبہ بندی کمیشن، ۱۹۶۶ء

وحید قریشی، ڈاکٹر، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ لاہور:
مکتبہ ادب جدید ۱۹۶۵ء

دیباچہ یا مقدمہ

دیباچہ یا مقدمہ، کسی بھی مقالے کے آغاز میں آتے ہیں لیکن تصنیفی ترتیب میں انھیں تحقیق کے آخری مرحلے میں لکھا جاتا ہے۔ دیباچے میں موضوع اور موضوع سے مقالہ نگار کے تعارف، اس کی ضرورت و اہمیت کا ذکر کیا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں مقالہ نگار کو دیباچے میں ان تمام افراد، کتب خانوں اور اداروں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جن کی راہنمائی اور مدد اسے دورانِ تحقیق میں حاصل رہی۔

مقدمہ میں موضوع کی ضرورت اور اہمیت کو تفصیل سے اجاگر کیا جاتا ہے اس میں متعلقہ موضوع کی مختلف جہات پر پہلے ہونے والے کام کا جائزہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور اپنے کام کے امتیاز، طریقِ کار اور اسلوب کا تعارف بھی کروایا جا سکتا ہے۔

مقالے کا اسلوب

کسی تحریر کی پہلی خوبی اس کا قابل مطالعہ (Readable) ہونا ہوتا ہے، معلومات کتنی بھی نادر کیوں نہ ہوں اگر قابلِ مطالعہ نہیں ہیں تو ان کا اِبلاغ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے تحقیقی مقالے کو انکشاف انگیزی کے ساتھ قاری کو گرفت میں لینے کے وصف کا بھی حامل ہونا چاہیے۔

مقالے کا اہم ترین وصف ایجاز ہے، علمائے بلاغت کے نزدیک ایجاز' مطلب کو ایسے لفظوں سے ادا کرنا ہے جو اصل مراد سے کم ہوں مگر نا کافی نہ ہوں'۔ محقق کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا، تحقیق کے دوران میں بہت سا مواد میسر ہو جاتا ہے، جس میں سے اکثر کی حیثیت محض ضمنی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک باغباں یہ جانتا ہے کہ پودے کی کون سی شاخیں چھانٹ دینی چاہیں اور کون سی شاخیں باقی رکھنی ہیں محقق کو بھی اس بات کا احساس ہونا چاہیے اور خریدار کو فرنیچر کے ساتھ برادہ تھمانے سے گریز کرنا چاہیے۔

عبارت صاف اور واضح ہونی چاہیے، اناطولِ فرانس نے اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا: 'وضاحت وضاحت وضاحت'، لیکن خیال رہے کہ ایسی وضاحت نہ ہو جس میں لفظوں کے اسراف یا تبذیر کا مظاہرہ کیا گیا ہو۔ لفظوں کے اسراف سے مراد ضرورت سے زائد الفاظ کا استعمال ہے اور لفظوں کی تبذیر سے ہماری مراد ان باتوں کا بیان ہے جن کے بیان کی ضرورت ہی نہیں۔ لفظ کا صحیح استعمال انسانی زندگی اور معاشرے کو امن اور سکون کا گہوارہ بنا سکتا ہے۔ غور کیا جائے تو انسان رشتوں اور روابط کی بنیاد لفظوں ہی سے استوار ہوتی ہے اور لفظوں ہی سے یہ رشتے منہدم بھی ہو جاتے ہیں اس لیے ایک تحقیق کار کو اپنے لفظوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

تحقیق، حقائق کی بازیافت کا عمل ہے اس لیے محقق کو غیر جانبدار اور غیر جذباتی ہونا چاہیے اس کے مقالے کا اسلوب بھی انھی صفات کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ پُر جوش خطیبانہ انداز، شاعرانہ جملے اور غیر منطقی و جذباتی انداز مقالے کو عیب دار بنا دیتے ہیں۔ مقالہ نگار کو طویل اقتباسات اور طویل جملوں سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ محض صفحات کو بڑھا دینے سے مقالے کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوتا بلکہ مقالے میں پیش کی گئی تحقیقات اور نتائج ہی اس کی قدر و قیمت کا صحیح تعین کرتے ہیں، خواہ اس کی ضخامت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

....

نوٹ: یہ تحریر ابتدائی طور پر اُردو بورڈ آف سٹڈیز پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایما پر تیار کی گئی، بورڈ آف سٹڈیز نے اپنے ایک اجلاس میں یہ طے کیا تھا کہ مقالہ نگار طالبِ علموں کے لیے مقالہ نگاری کے طریقِ کار اور ضوابط کو متعین کر دیا جائے تاکہ ان کے لیے سہولت کے ساتھ ساتھ طریقِ کار میں یکسانیت بھی پیدا ہو سکے، جس کے نتیجے میں یہ تحریر تیار کی گئی اور اسے بورڈ آف سٹڈیز نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۸ء میں منظور کر لیا۔ ابتدا میں اس تحریر کے چار عنوانات (موضوع کا انتخاب، مواد کی فراہمی، خاکے کی تیاری، تحریر و ترتیب) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے لکھے تھے۔ اب اس تحریر پر نظرِ ثانی کی گئی ہے اور بہت سے حصے نئے لکھے گئے ہیں، بازنظری کے اس عمل میں محترم ہاشمی صاحب کی اجازت سے، ان کے لکھے ہوئے عنوانات میں بھی معتدبہ اضافے کر دیے گئے ہیں۔

گلشنِ ہند......ایک نامکمل اندراج کی تکمیل

تنقید جس منزل میں بھی پہنچ جائے اپنی اصل سے بیگانہ نہیں ہو سکتی۔ تنقید کی اصل متن ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں بہت سے شعرا کے دستیاب متون کا واحد مآخذ وہ تذکرے ہیں جو قدیم روش اور اسلوب کے تحت لکھے گئے۔ ان تذکروں پر کیے جانے والے قدامت اور فرسودگی کے اعتراضات اپنی جگہ لیکن یہ تذکرے نہ ہوتے تو ہم اپنے کلاسیکی سرمائے کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو چکے ہوتے۔ کلاسیکی شعرا کے بارے میں ہمیں آج جو کچھ معلوم ہے اُس کی اساس یہی تذکرے ہیں۔ ان تذکروں میں اگرچہ بیشتر مداحی اور تقریظ نما تعارف ہے لیکن بین السطور ایسی معلومات بھی مل جاتی ہیں جو آج شعرا کے سوانح اور فن کے حوالے سے کلیدی راہ نمائی فراہم کر سکتی ہیں۔ اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ میر تقی میر (۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲-۲۳ء........۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کا نکات الشعرا ہو یا قیام الدین قائم چاند پوری (۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء......م۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳-۴ء) کا مخزنِ نکات۔

ایک بات واضح ہے کہ اس سفر کا آغاز فارسی تذکرہ نویسی سے ہوا۔ نکات اور مخزن دونوں فارسی میں لکھے گئے۔ اُردو شعرا کا تذکرہ اُردو میں لکھنے کا اعزاز مرزا علی لطف (م۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) کے لیے مخصوص تھا جس نے ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں پہلی بار گلشنِ ہند کے نام سے اُردو زبان میں شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ مرتب کیا۔ یہ تذکرہ اپنی اوّلیت ہی کے حوالے سے اہم نہیں بلکہ اپنے بعض اندراجات اور معلومات کے حوالے سے بھی اہم ہے۔ گلشنِ ہند فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر جان گلکرسٹ (۱۷۵۹ء۔۔۔۔۔ ۱۸۴۱ء) کی فرمائش پر لکھا گیا۔ ۱ میر امن کی باغ و بہار بھی گلکرسٹ کی فرمائش پر فورٹ ولیم کالج ہی سے شائع ہوئی تھی۔ میر امن نے بہ قول خود باغ و بہار ۱۸۰۲ء میں مکمل کی ۲ اور ۱۸۰۳ء میں پہلی مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ ۳ اس اعتبار سے گلشنِ ہند کی اُردو نثر کو باغ و بہار پر زمانی تفوّق حاصل ہے۔ اس کی نثر اگرچہ مقفّٰی ہے لیکن صاف ہے، یوں یہ تذکرہ اردو نثر کے ارتقا کے حوالے سے بھی قابلِ توجہ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

مطالب کے اعتبار سے یہ تذکرہ بعض نادر معلومات فراہم کرتا ہے مثلاً یہ کہ میر تقی میر نے حصولِ ملازمت کے لیے فورٹ ولیم کالج میں درخواست دی تھی اور بعد ازاں کرنل اسکاٹ نے اُن کا انٹرویو بھی کیا تھا لیکن بڑھاپے کے سبب میر صاحب ملازمت پانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی ترجمے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ترجمۂ میر کا ادخال ۱۲۱۵ھ میں کیا گیا جس سے تذکرے کے زمانۂ تالیف کی نشان دہی ہوتی ہے۔ لطف کی پُر لطف عبارت درج ذیل ہے:

''میر سا شاعر جو کہ سحر کاریِ سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازیِ بیان

میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنو کو گئی، تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے، اور جوانانِ نومشق مربّی گری سے [سبب] قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔" ۴

اس تذکرے کی اساس علی ابراہیم خان خلیل (۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء......۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء) کا فارسی تذکرہ گلزارِ ابراہیم بنا جو ۱۱۹۴ھ......۱۱۹۸ھ کے دوران میں لکھا گیا۔ گلشنِ ہند، گلزارِ ابراہیم کی "اصلاح یافتہ شکل" ہے ۵ لطف نے اس تذکرے کی عبارات کو بیشتر اُردو میں منتقل کیا اور اضافے بھی کیے۔ اگرچہ اضافوں سے زیادہ تقلیل کی گئی، گلزارِ ابراہیم میں ۳۲۵ شعرا کے تراجم ہیں (۳۲۰ کے نہیں، جیسا کہ ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر فرمان فرماتے ہیں ۶) جن میں سے ہمارے پیشِ نظر نسخے کے مطابق لطف کے تذکرے میں ۷۰ شعرا کے تراجم درج ہیں (گلشن کی فہرست میں سہواً ایک اندراج کم ہے) ان میں سے بھی اگر لطف کا اپنا ترجمہ نکال دیا جائے تو گلزارِ ابراہیم کے ۶۹ تراجم رہ جاتے ہیں۔ اپنا ترجمہ لطف کا اضافہ ہے، البتہ بعض دوسرے معاصرین، جن سے لطف واقف تھے ان کے بارے میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

اس مضمون میں ہمارے پیشِ نظر ایک مثال کے ذریعے گلشنِ ہند کے خطی نسخوں اور مطبوعہ نسخے کا فرق واضح کرنا ہے اس مقصد کے لیے ہم نے ترجمۂ سوز کو منتخب کیا ہے، اس لیے مناسب ہوا اگر پہلے گلشنِ ہند کے مآخذ گلزارِ ابراہیم سے اس اندراج کی عبارت خواندگانِ کرام کی خدمت میں پیش کی جائے۔ گلزارِ ابراہیم اُردو شعرا کا نہایت اہم تذکرہ ہونے کے باوجود عام اُردو قاری کی دسترس سے دور ہے اس کے

خطی نسخے تو کراچی، پٹنہ، رام پور، حیدر آباد اور یورپ وغیرہ میں موجود ہیں لیکن اس کا متن مطبوعہ صورت میں قارئین کی دسترس میں نہیں ہے۔ ذیل میں گلزارِ ابراہیم کا ترجمۂ سوز نقل کیا جاتا ہے اس کے بعد گلشن کا ترجمۂ سوز پیش کیا جائے گا ان دونوں کا فرق دکھایا جائے گا اور پھر مرتبِ گلشن مرزا علی لطف کے انتخابِ کلام اور مطبوعہ نسخے کے مرتبین کے تصرفات کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

''سوز تخلص، دہلوی، اسمش سید محمد، ساکنِ قراول پورہ شاہجہاں آباد از سادات و مشاہیر سخنوران است۔ درادابندی و انداز طبعش رسا و درفن کمانداری دست و دلش آشنا۔ گویند خط راز یبا می نویسد و شعر را بطورِ خاص و اسلوبِ مرغوب میخواند۔ در بدایتِ حال بکامِ دل گزرانیدہ و آخر بہ دلالتِ وارستگی بسال ہجدہ شاہ عالم بادشاہ لباسِ درویشی اختیار کردہ۔ الحال کہ سال یکہزار و یکصد و نود و شش ہجری است در لکھنو میگذراند۔ ہر چند راقم خاکسار آن سید والا تبار را تا سنہ سطور [مسطور] ندیدہ اما بسال مذکور پارۂ از اشعارِ خود و چند فقرہ نیز باین خاکسار نوشتہ از آنجاست کہ:
''میر سوز شخصے است کہ ہیچکس را از حلاوتی جز سکوت و اکراہ حاصل نشود۔ این نیز از قدرت کمال الٰہی است کہ ہر یکی بلکہ خار و خسی نیست کہ بکار چند نیاید پس اگر منکری سوال کند کہ نا کارۂ محض نیفتادہ [نہ آفریدہ] است [جواب] اینست کہ نامش سوختنی ست۔ بالجملہ کلام فصاحت انتظامش [بودن؟] بنظر افتادہ۔ این اشعار خلاصۂ دیوانِ آن برشتہ گفتار است:''[۷]

گلزارِ ابراہیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ محض اس کی اساس پر اردو میں دو مستقل تذکرے لکھے گئے، لطف کا گلشنِ ہند ان میں سے ایک ہے۔ لطف کا یہ تذکرہ ڈرامائی انداز میں اُردو دنیا تک پہنچا۔ یوں تو ہر واقعہ وقت کے تیز

قدموں کی گرد ہو جاتا ہے لیکن بعض حوادث اپنے پیچھے کچھ یادگاریں چھوڑ جاتے ہیں۔
۱۳۲۰ھ میں حیدر آباد دکن کی موسیٰ ندی میں آنے والی طغیانی ایک ایسا ہی حادثہ تھا۔اس ندی کے بپھر جانے سے شہر میں سیلابِ عظیم آیا جس سے بڑے پیانے پر تباہی ہوئی لیکن اس سیلاب نے اُردو دنیا کو دو تحفے دیے: ایک اس سیلاب کی تباہ کاریوں پر کہی گئی ظفر علی خان کی طویل نظم شورِ محشر اور دوسرے لطف کا تذکرہ گلشنِ ہند۔

سیلاب کی تباہ کاریوں سے کتب خانے بھی نہ بچے۔اس افتاد کے ہاتھوں برباد ہونے والے ایک کتب خانے میں گلشنِ ہند کا خطی نسخہ بھی تھا۔اس کتب خانے کی کتب کوڑیوں کے بھاؤ فروخت ہوئیں۔ان میں مولوی غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کو یہ مخطوطہ ملا، مولوی صاحب نے یہ خطی نسخہ مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء......۱۹۱۴ء) کو دکھایا۔شبلی نے اس نسخے پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے مرتب کرنے کا وعدہ کیا۔شبلی نعمانی کے حواشی اور مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء...... ۱۹۶۱ء) کے مقدمے کے ساتھ اس تذکرے کو عبداللہ خان نے ۱۹۰۶ء میں پہلی بار شائع کیا۔کتاب کے ناشر عبداللہ خان نے ''پبلشر کی التماس'' کے زیرِ عنوان وضاحت کی ہے کہ:

> ''اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے البتہ صرف اتنا تصرّف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونہء کلام جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا اس میں سے صرف عمدہ نمونہ چُن لیا گیا ہے اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوقِ سلیم نے انجام دیا ہے۔اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا۔'' [8]

جب کہ عبدالحق نے اختصار کی ذمہ داری یہ کہہ کر پبلشر پر ڈال دی ہے کہ ''جن

لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے'' ۹

لیکن حقیقت یہ ہے کہ گلشنِ ہند کا یہ مطبوعہ نسخہ پبلشر کی اس التماس اور مولوی عبدالحق کی برات میں مذکور تقلیل کے علاوہ بھی اپنی اصل سے کم تر ہے۔ مولوی عبدالحق نے یہ اعتراض کیا ہے کہ لطف نے شعرا کے کلام کے وہ حصے منتخب کیے ہیں جن سے ان کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ ''صاحبِ تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے کہ مثنوی (خواب وخیال) کا وہ حصہ منتخب کیا جن سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، سراپا کا مضمون اس قدر مبتذل ہے کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا یا اس میں زبان کی فصاحت وسلاست دکھانا بہت مشکل ہے۔'' ۱۰ لیکن خود مولوی عبدالحق نے لطف کے انتخاب کردہ اشعار کو بھی کم کر دیا ہے، عبداللہ خان نے صرف میر، سودا، درد اور مصنف کے انتخابِ کلام میں کمی کا اعتراف کیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے شعرا کے انتخابِ کلام میں سے اشعار حذف کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ تذکرہ اپنی اصل سے دُور جا پڑا ہے۔ قاضی عبدالودود نے معاصر ۱۵ میں گلشنِ ہند پر ایک مضمون لکھا تھا ۱۱ اس مضمون میں انھوں نے مولوی عبدالحق کے مقدمے کے تسامحات پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے پیش نظر اس تذکرے کا ایک ہی خطی نسخہ تھا لیکن مولوی صاحب کے مقدمے اور تسامحات پر مضمون لکھتے ہوئے قاضی صاحب کے پیش نظر گلشنِ ہند کا ایک بھی خطی نسخہ نہیں تھا جیسا کہ انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے:۔ ''گلشن کا کوئی نسخہ اس وقت پیشِ نظر نہیں کہ ڈاکٹر عبدالحق کے انتخاب کے متعلق کوئی رائے دی جا سکے'' ۱۲ یہ دیکھنے کے لیے کہ لطف نے شعرا کا جس قدر کلام درج کیا تھا مولوی عبدالحق صاحب نے اس میں کس قدر تخفیف کی ہمارے پیشِ نظر گلشنِ ہند کے تین خطی نسخوں کے عکس

ہیں۔مناسب ہو اگر پہلے ان خطی نسخوں کا تعارف کروادیا جائے:

۱۔تیرہ سطری مسطر کے ۱۹۵ صفحات پر مشتمل ہے سنہ کتابت ۱۲۴۳ھ کاتب کا نام درج نہیں۔آغاز ''یا علی اور کنی ربِ یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وتمم بالخیر''۔۔۔اختتام:''اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ساتھ + ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا'' ترقیمہ:''بتاریخ شانزدہم شہر جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ''

ہم نے اس نسخے کا نام مولوی عبدالحق کے نام کی رعایت سے ''ع'' رکھا ہے اور اس مضمون کے ساتھ خطی نسخے کے اُن صفحات کا عکس شائع کیا جارہا ہے جن میں ترجمۂ سوز مندرج ہے۔

۲۔پندرہ سطری مسطر کے ۴۳۶ صفحات پر مشتمل ہے سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں۔آغاز :تذکرہ گلشنِ ہند بسم اللہ الرحمٰن الرحین و بہ نستعین۔رعنائی اور زیبائی دلبرانِ سخن کو اس زینت آفرین کی حمد سے حاصل ہے۔جس نے معشوقانِ زبانِ ریختہ کو یہ لباسِ بوقلموں پہنایا۔۔۔اختتام:اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کیساتھ + ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا ترقیمہ درج نہیں البتہ آغازِ عبارت سے پہلے ایک شعر کے بعد بابو ولد مارو کی دو چھوٹی مربع مہریں ثبت ہیں جن میں ۱۳۰۵ھ درج ہے۔

ہم نے اس نسخے کا نام اس کے بلا تاریخ ہونے کی رعایت سے ''ب'' رکھا ہے۔

۳۔سترہ سطری مسطر کے ۴۵۵ صفحات پر مشتمل ہے سنہ کتابت ۱۲۵۴ھ اور کاتب کا نام عبدالقادر مقام سکندر آباد (حیدر آباد)۔آغاز :ربِ یسر وتمم بالخیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔رعنائی وزیبائی دلبرانِ سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے۔جس نے معشوقانِ زبانِ ریختہ کو یہ لباسِ بوقلموں رنگ پہنایا۔۔۔اختتام:اندھیر ہے جہاں میں کہ اب

شامیوں کیساتھ + ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا ترقیمہ: تمت کتاب بعون ملک الوہاب تاریخ پانزدہم شہر محرم الحرام ۱۲۵۴ ہجری بروز چہارشنبہ بوقت صبح بمقام چھاؤنی سکندرآباد کہ متعلقہ حیدرآباد بید احقر العباد عبدالقادر متوطن امتیاز گڑھ عرف لوہونی صوبی دارالظفر بیجا پور بخطِ خام صورتِ اختتام بوقوم (برقم؟) پیوست۔ آغاز مخطوطہ سے پہلے ایک صفحے پر درج ہے کہ یہ کتاب تذکرۃ الشعرائے ہندی ملکیت سے منشی میر قادر علی کرمانی کی ہے۔ [13] ہم نے اس نسخے کا نام اس کے کاتب عبدالقادر کے نام کی رعایت سے "ق" رکھا ہے۔

اب ذیل میں گلشنِ ہند کا ترجمۂ سوز نقل کیا جاتا ہے: "م" سے مراد مطبوعہ نسخہ ہے

"سوز تخلص، سید میر نام ساکن قراول پورہ شاہ جہان آباد۔ سیدِ عالی نسب [ع، ب، ق: نصب] اور فنِ سخنوری میں اُستاد، طرز ادا بندی کے بادشاہ، اور صورتِ مضمون درد و آہ تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے، اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔ شعر کے پڑھنے میں صاحبِ طرزِ خاص تھے اور آئینِ محبت میں مایۂ مودت [ع: مروت] و اخلاص۔ علمِ تیراندازی اور کمان داری میں بہ شدت دل آشنا رکھتے تھے، اور حسنِ شفیعا [م، ع: شفیعہ] نویسی میں نہایت دستِ رسا۔ ابتدائے جوانی میں انھوں نے ساتھ کامِ دل کے ایامِ زندگانی [ع، ب، ق: زندگی] کو صرفِ نشۂ بے خمار کیا اور سنہ اٹھارھویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ مزاجی کی تکلیف [م، ع، ق: مزاجی تکلیف] سے لباسِ فقر اختیار کیا۔ لکھنو میں تشریف رکھتے تھے اور اوقات ساتھ توکل و [ق: اور] قناعت کے بسر کرتے تھے۔ ۱۲۱۲ سنہ بارہ سو بارہ ہجری [ع، ب، ق: سنہ بارہ سو بارہ ہجری] میں مرشدآباد تک تشریف لائے، لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اُسی سال پھر لکھنو تشریف لے گئے، اور اس [ع، ق: اوس] دارِفنا سے راہی ملک بقا کے ہوئے۔ علی

ابراہیم خان مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ ''جس سال یہ تذکرہ [ع، ب، ق: تذکرا] میں لکھتا ہوں تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع [ع، ب، ق: معہ] چند فقرہ نثر لکھ کر مجھے بھجوائے تا کہ داخل تذکرہ کروں۔'' چنانچہ ایک آدھ [م، ع، ق: آدہ، ب: آدہ فقرا] فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مسطور [م: مذکور] نے تذکرے میں لکھا ہے۔ ترجمہ اس کا زبانِ ریختہ میں راقم حقیر [ع: فقیر؟] نے اس طرح کیا ہے ''کہ جو شے حق سبحانہ تعالیٰ نے خلق کی [م: کیا] ہے بلکہ جتنے خار وخس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں، اور بندگانِ خدا اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر میر سوز [م: یہ سوز] وہ شخص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے، سوائے سکوت [م، ب: سواء سکوت، ق، ع: سوائے سکونت اور] اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ! یہ بھی قدرتِ الٰہی کا اظہارِ کمال ہے، کہ ایسی شے خلق کی جاوے۔ جس سے کوئی فائدہ [ب: فائدا] نہ اُٹھاوے۔ پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ نا کارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اُس کا قابل جلانے کے ہے''۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں۔ یہ اشعار [م، ب: اشعار بدونِ یہ] منتخب ان کے لکھے جاتے یہاں ہیں ولہ'' [۱۴]

یہ عبارت کم وبیش گلزار کی ترجمانی ہے، البتہ آخری حصہ لطف کا اضافہ ہے، ذیل میں دونوں تراجم (گلزار و گلشن) کا تقابل پیش کیا جاتا ہے تا کہ خوانندگانِ کرام علی ابراہیم خان خلیل کی اصل عبارت اور لطف کے ترجمے اور اضافے کا اندازہ لگا سکیں۔

گلزارِ ابراہیم	گلشنِ ہند
سوز تخلص، دہلوی اسمش سید محمد	سوز تخلص، سید میر نام
از سادات ومشاہیر سخنوران است	سیدِ عالی نسب اور فنِ سخنوری میں استاد

دراد ابندی و انداز طبعش رساو درفن کمانداری

دست ودلش آشنا

گویند خط راز یبامی نویسد

وشعر رابطورِ خاص واسلوبِ مرغوب میخواند

در بدایتِ حال بکام دل گزرانیده

آخر بہ دلالت و ارستگی بسال ہجدہ شاہ عالم

بادشاہ لباسِ درویش اختیار کردہ

الحال کہ سال یکہزار و یکصد و نود و شش ہجری

است در لکھنو میگزراند۔

ہر چند راقم خاکسار آن سید والا تبار را تا سنہ

مسطور ندیدہ۔

اما بسالِ مذکور پارۂ از اشعارِ خود و چند فقرہ نیز

باین خاکسار نوشتہ از آنجاست کہ......

باالجملہ کلام فصاحت انتظامش بنظر افتادہ۔ این

اشعار خلاصۂ دیوانِ آن برشتہ گفتار است......

فنِ سخن وری میں استاد، طرز ادابندی کے بادشاہ

حسن شفیعا نویسی میں نہایت دستِ رسا

شعر کے پڑھنے میں صاحبِ طرزِ خاص تھے

ابتدائے جوانی میں انھوں نے ساتھ کام دل کے

ایامِ زندگانی کو صرف نشہ بے خمار کیا

سنہ اٹھارویں میں، جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے،

وارستہ مزاجی کی تکلیف سے لباسِ فقر اختیار کیا

علی ابراہیم خان مرحوم نے گلزارِ ابراہیم میں لکھا

ہے کہ: ''جس سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں، تو

میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چند فقرۂ نثر لکھ کر

مجھے بھجوائے تا کہ داخلِ تذکرہ کروں'' چنانچہ

ایک آدھ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مذکور

نے تذکرے میں لکھا ہے، ترجمہ اُس کا زبانِ

ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے......

کلام اُن کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے اور

پاؤں سے سر تک ناز و نیاز:

غرض میر مذکور صاحبِ دیوان ہیں، اشعار منتخب

اُن کے لکھے جاتے یہاں ہیں......

اس تقابل سے واضح ہو جاتا ہے کہ گلشن کا ترجمہ سوز گلزار کی ایک ہوش مندانہ ترجمانی ہے جس میں زمانی تغیر اور نویسندہ کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے، علی ابراہیم خان فارسی عبارت کے واحد متکلم تھے، لطف نے اس کا رُخ اپنی طرف کیا جہاں علی ابراہیم

خان کا حوالہ ضروری تھا حوالہ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ لطف نے علی ابراہیم خان خلیل کے نوشتے پر ضروری اضافہ بھی کیا ہے۔ اس حد تک گلشن کا موجودہ روپ گلزار سے ماخوذ ہے۔ جہاں تک انتخابِ کلام کا تعلق ہے تو گلزار اور گلشن کے ترجمۂ سوز میں دیے گئے انتخابِ کلام کا موازنہ کرنے سے یہ دلچسپ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دونوں تذکروں کے انتخابِ کلام میں کوئی اشتراک نہیں پایا جاتا، گلزار کا انتخاب بالکل الگ، بہت طویل اور باقاعدہ ردیف وار ہے جس میں ردیف الف، ب، ت، چ، ح، د، ر، ز، س، غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ے کے اشعار انتخاب کیے گئے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے مرتبہ نسخۂ گلزار میں انتخاب کے آخر میں ردیف یے کے بعد ردیف الف کے دو مزید اشعار درج ہیں (یہ خلافِ ضابطہ ہے اگر کسی دوسرے نسخے میں دو شعر زائد تھے تو انھیں ردیف الف ہی میں درج کرنا چاہیے تھا اور وہیں وضاحت چاہیے تھی لیکن یہاں دونوں باتوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا) مختلف محققین گلزار میں انتخابِ سوز کے اشعار کی تعداد مختلف بتاتے رہے ہیں مثلاً ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے یہ تعداد ۲۰۰ بتائی ہے، عطا کاکوی نے، جنھوں نے گلزار کا جوڑ مبتلا کے گلشنِ سخن سے جا ملایا ہے، تعداد اشعار ۱۹۲ لکھی ہے ۱۵؎ لیکن گلزار کا متن دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعداد اشعار ۱۹۲ ہے نہ ۲۰۰ بلکہ اگر ردیف الف سے یے تک مرتب انتخاب کا شمار کیا جائے تو ۱۹۵ اور اگر بعد میں ایزاد کیے گئے دو مزید شعر ملائے جائیں تو ۱۹۷ ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے گلزارِ ابراہیم میں مندرج انتخابِ کلامِ سوز کو ایک ضمیمے کے طور پر شاملِ کتاب کر دیا ہے اور اس کا متن پروفیسر کلیم الدین احمد کے مرتبہ نسخے کے مطابق رکھا ہے۔

سطورِ ماقبل میں ذکر ہوا کہ جب گلشنِ ہند شائع کیا گیا تو اس کا ایک ہی خطی

نسخہ دستیاب تھا اور بعض اصحاب کے خیال میں جیسا کہ ڈاکٹر الیاس اعظمی نے لکھا ہے: ''اب تک گلشنِ ہند کا کوئی مخطوطہ سرے سے دستیاب ہی نہیں ہو سکا ہے اس لیے مولانا شبلی کے مرتب کردہ متن کا کوئی موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا'' ۱۶ یہ محض غلط فہمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اب گلشنِ ہند کے متعدد خطی نسخے دریافت ہو چکے ہیں انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں اس کے چار نسخے موجود ہیں جن میں سے تین کا تعارف پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب کی مرتب کردہ جائزہ مخطوطاتِ اُردو میں چاروں نسخوں کا تفصیلی تعارف موجود ہے جس میں دیگر نسخوں کے ضمن میں رضا لائبریری رام پور مکتوبہ ۱۲۵۲ھ/ ۱۸ر ستمبر ۱۸۳۶ء انڈیا آفس لائبریری لندن مکتوبہ انیسویں صدی عیسوی، کتب خانہ ء سالار جنگ حیدر آباد دکن ترقیمہ ندارد، ببیلوتک ناسیونال (پیرس) مکتوبہ ۱۲۵۳ھ، کتب خانہ گارسیں دتاسی مکتوبہ ۱۲۲۳ھ، ایشیاٹک سوسائٹی لندن مکتوبہ ۱۲۵۵ھ، ایڈورڈ ہال اور اشپرنگر کے کتب خانوں میں موجود خطی نسخوں کا پتہ چلتا ہے ۱۷ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی گلشنِ ہند کے بارہ قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں اور مشفق خواجہ کے بیان کردہ نسخوں میں بعض مختلف ہیں ۱۸ وہ نسخہ جو موسیٰ ندی کے سیلاب میں بہتا ہوا مولوی غلام محمد حیدر آبادی تک پہنچا تھا اگرچہ گلشنِ ہند کی مطبوعہ صورت میں موجود ہے لیکن اب اس کے خطی نسخے کا کچھ علم نہیں۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا ہے کہ (گلشنِ ہند میں) ''شعرا کے حالاتِ زندگی قلمی نسخے کے مطابق ہیں'' ۱۹ اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے مطبوعہ نسخے کا قلمی نسخے سے موازنہ کیا ہے لیکن خود ان کے بیان کردہ قلمی نسخوں میں مطبوعہ نسخے کی بنیاد بننے والے قلمی نسخے کا کوئی ذکر نہیں۔ شاید انھوں نے یہ بات محض عبدالحق کے مقدمے کی روشنی میں قیاساً لکھ دی ہے۔

گلشنِ ہند میں ترجمہء سوز کی عبارت دیکھنے کے بعد پیشتر اس سے کہ ہم گلشن کے انتخابِ کلامِ سوز پر نظر ڈالیں۔ مناسب ہوا گر اس ترجمے کے حوالے سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مرتبہ گلزارِ ابراہیم کے حوالے سے چند نکات کی وضاحت کر دی جائے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے گلزارِ ابراہیم اور گلشنِ ہند کو ملا کر جو مجموعہ مرتب کیا تھا اس میں ڈاکٹر صاحب نے گلشن کے تراجم نقل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ گلزار میں یہ اندراج کتنی سطور پر مشتمل تھا اور کتنے شعرا انتخاب کیے گئے تھے اس کے ساتھ گلزار کے خطی نسخے کا ورق نمبر بھی بتایا گیا ہے۔ زور صاحب نے مقدمے میں تسلیم کیا ہے کہ لطف نے گلزار کے تراجم پر اضافے کیے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ اضافے ۲۵ شعرا کے تراجم میں ہیں ان شعرا میں سوز کا نام شامل نہیں ۲۰ زور صاحب کے نسخے میں جہاں ترجمہء سوز درج ہے وہاں مرتب کی طرف سے یہ عبارت بھی ایزاد کی گئی ہے:

> ''سوز، سید محمد بالکل ترجمہ ہے لیکن اصل تذکرہ میں سوز نے اپنے اشعار کے ساتھ اپنے احوال میں جونثر کے فقرے لکھے وہ موجود ہیں۔ گلشن ہند میں ان کا کوئی ذکر نہیں'' ۲۱

افسوس کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، گلشن میں سوز کا ذکر محض گلزار سے ترجمہ نہیں ہے اس میں لطف کے اضافے اور تبدیلیاں واضح ہیں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں دونوں متون کے تقابل سے ظاہر کیا جا چکا ہے:

۱۔ اس ترجمے میں لطف نے علی ابراہیم خان خلیل کا ذکر یوں کیا ہے: ''علی ابراہیم خان مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ'' اس کے بعد لکھا ہے کہ

''چنانچہ ایک آدھ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مذکور نے تذکرے میں لکھا ہے ترجمہ اس کا زبان ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے'' ۲۲

اس اسلوب اور میر سوز کی نثر کے ترجمے سے زور صاحب کی دونوں باتیں باطل ہو جاتی ہیں۔ گلشن کے ترجمہء سوز میں (جیسا کہ خوانندگانِ کرام سطور ماقبل میں مطالعہ فرما چکے ہیں) میر سوز کے ۱۲۱۲ھ میں لکھنو سے مرشد آباد جانے اور پھر اسی سال واپس لکھنو آنے اور انتقال کر جانے کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مقدمے میں تسلیم کیا ہے کہ گلزار ان تذکروں میں شامل ہے جو ۱۲۰۰ھ سے قبل لکھے گئے اور یوں بھی ابراہیم خان ۱۲۰۸ھ میں انتقال کر گئے تھے، آصف الدولہ کا انتقال ۱۲۱۲ھ میں اور سوز کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا۔ علی ابراہیم ان واقعات کا کیسے ذکر کر سکتے تھے، یقیناً اور بالکل واضح ہے کہ یہ اضافے لطف کے ہیں۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت (اُستاد، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن) نے لطف کی مثنوی نیرنگِ عشق مرتب کی ہے اور اس پر ایک مقدمہ لکھا ہے انھوں نے گلزارِ ابراہیم کے مرتب کے اس تسامح کی نشان دہی کی ہے لیکن خود ان کے بیان میں کچھ مغالطہ پیدا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ لکھتی ہیں: آصف الدولہ کا انتقال ۱۲۱۲ھ میں ہوا اور لطف کے بیان کے مطابق خود سوز بھی اسی سال رحلت کر گئے اس بنا پر لالہ سری رام اور سکسینہ کے بیانات درست نہیں رہتے کہ سوز مرشد آباد سے لوٹنے کے دو برس کے اندر انتقال کر گئے رام بابو سکسینہ سے اس سلسلے میں ایک غلط بیانی بھی سرزد ہوئی ہے وہ لکھتے ہیں کہ لطف نے سوز کے انتقال کا سنہ ۱۲۱۳ہجری بتایا ہے یہ صریحاً بے بنیاد ہے تذکرے میں صاف طور پر ۱۲۱۲ھ درج ہے۔ ۲۳

ڈاکٹر ثمینہ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ رام بابو سکسینہ نے اس غلطی کو بنیاد بنا کر سوز کے سنہ وفات کے بارے میں مزید بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کے خیال میں لطف کا بتایا ہوا سنہ وفات (۱۲۱۳ھ) ہی درست ہے۔ [۲۴]

گویا ڈاکٹر ثمینہ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ سوز کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں نہیں ہوا (جو کہ نادرست ہے) البتہ یہ درست ہے کہ گلشنِ ہند میں سوز کا سالِ وفات واضح طور سے ۱۲۱۲ھ درج ہے لیکن تذکرے میں درج ہونا لازماً درست ہونے کو مستلزم نہیں اور یہ درست ہے بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سکسینہ پر اعتراض کرتے ہوئے ڈاکٹر ثمینہ سے خود سہو ہوا ہے، وہ لکھتی ہیں کہ "ان کے خیال میں لطف کا بتایا ہوا سنہ وفات (۱۲۱۳ھ) ہی درست ہے"

یہ درست ہے کہ لطف نے سوز کا سال وفات ۱۲۱۲ھ لکھا ہے اور سکسینہ نے اسے ۱۲۱۳ بنا دیا ہے اگرچہ ترجمہء سوز میں سکسینہ کے بیانات مغالطہ انگیز ہیں لیکن ۱۲اور ۱۳ میں اشتباہ بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ثمینہ جس بات پر سکسینہ پر معترض ہیں اور لطف کی حمایت میں پر جوش ہیں وہ بات سرے ہی سے درست نہیں۔ اس لیے کہ لطف کا بیان کردہ سنہ ۱۲۱۲ھ اصلاً غلط ہے، سکسینہ نے غلطی سے لطف کی عبارت میں سنہ ۱۲۱۳ھ لکھ دیا ہے لیکن یہ خطا راجع بہ صواب ہے، اس لیے کہ ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا اور سوز اس سے اگلے برس یعنی ۱۲۱۳ھ میں ملک عدم کو سدھارے۔

سکسینہ کی کتاب محققانہ نہیں ہے اس میں بہت سے تاریخی تسامحات ہیں ڈاکٹر ثمینہ تو تحقیقی انداز میں ایک متن مرتب کر رہی تھیں، ان سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ انھوں نے سوز کے معاصرین کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخِ وفات نہیں دیکھے اگر وہ ان قطعات سے

رجوع کرتیں تو اس غلطی سے محفوظ رہ سکتی تھیں سوز کے انتقال پر ان کے معاصرین شاہ کمال، جرات اور ناسخ نے ان کے قطعاتِ تاریخِ وفات کہے تھے ان سب سے مادۂ تاریخ ۱۲۱۳ھ برآمد ہوتا ہے۔فہوٰہذا؛ شاہ کمال: گفت تاریخ سوز سوخت دلم =۱۲۱۳ھ جرات: داغ اب سوز کا لگا دل کو =۱۲۱۳ھ ناسخ: شاعر بے مثال وا ویلاہ =۱۲۱۳ھ ۲۵ ان مادۂ ہائے تاریخ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ گلشن ہند میں بیان کردہ سوز کا سال وفات غلط ہے اور ڈاکٹر ثمینہ کا اصرار بھی غلط ہے۔

آغاز میں ذکر ہوا تھا کہ گلزار کی بنا پر دو مستقل تذکرے لکھے گئے لطف کے گلشنِ ہند کا تفصیلی تعارف تو کروایا جا چکا، دوسرے تذکرے کا نام بھی گلشنِ ہند ہے یہ تذکرہ سید حیدر بخش حیدری نے مرتب کیا اس کے چار قلمی نسخے معلوم ہو چکے ہیں حیدری بھی فورٹ ولیم کالج سے منسلک تھے اور علی ابراہیم خان خلیل کے شاگرد اور متوسّل تھے۔ یہ تذکرہ گلزار کی ایک ناقص تلخیص اور نقل ہے محض چند مقامات ایسے ہیں جہاں حیدری نے کوئی جملہ اپنی طرف سے بڑھایا ہے یا کوئی شعر اضافہ کیا ہے۔ حیدری کا یہ تذکرہ دو خطی نسخوں (انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ اور برٹش میوزیم لندن) کی مدد سے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نہایت عمدگی سے مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں ۲۶ لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے گلزارِ ابراہیم کے اس تذکرے کا ماخذ ہونے کا کوئی ذکر نہیں فرمایا جب کہ تذکرے کے طبع زاد ہونے سے متعلق حیدری کے بیانات محض دوروغ بافی ہیں اور کچھ بھی نہیں حیدری ایک کم علم شخص تھے انھوں نے نقل میں بھی سلیقے کا ثبوت نہیں دیا جس کی مثال خود ترجمۂ سوز ہے انھوں نے سوز نام کے دو الگ شاعر بنا دیے ہیں۔ ایک کا نام میر سوز اور دوسرے کا سید محمد سوز بنا دیا ہے جب کہ دونوں کے انتخاب میں جو شعر لکھے ہیں وہ سید محمد

میر سوز کے ہیں [27] اس صورت حال سے لطف کے گلشن کی اہمیت مزید واضح ہو جاتی ہے۔

گلشنِ ہند میں شامل ترجمۂ سوز کی عبارت دیکھنے اور اس سے متعلق راہ پا جانے والی غلطیوں کی تصحیح کرنے کے بعد اب ہم انتخابِ کلام پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ گلشن کے مطبوعہ نسخے میں سوز کے ایک سو بارہ (۱۱۲) اشعار درج ہیں، ہم نے جن تین خطی نسخوں کا ذکر کیا ہے ان میں سوز کا ترجمہ ایک سو ستائیس (۱۲۷) اشعار پر مشتمل ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ گلشن کی مطبوعہ صورت سے صرف سوز کے پچیس اشعار غائب ہیں، یہ پچیس اشعار ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ گلشن کے خطی نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات حواشی میں ظاہر کر دیے گئے ہیں [28]

۱۔ [29] میں اپنے دل سے پوچھا تو ہے غلام کس کا
بولا ہے قاب قوسین [30] ادنا مقام جس کا

۲۔ قضارا وہ قاتل ادھر آن نکلا
کہ لینے کو اس کے مرا جان نکلا

۳۔ کھڑا نعش پر ہو کے بولا کہ ہے ہے
یہ کشتہ تو کچھ جان پہچان نکلا

۴۔ کسی نے روم لی قسمت میں کوئی شام لے آیا
ہمیں کچھ لے نہ آیا ایک [31] تیرا نام لے آیا

۵۔ صدا ہے در پہ کچھ پیغام بر کی سی خدا جانے
نویدِ وصل [32] ہے یا ہجر کا پیغام لے آیا

۶۔ مجھے تکلیف ترکِ عشق اب کرتے [33] جو ہیں ناصح
کدھر ان پختہ مغزوں کو خیالِ خام لے آیا

۷۔ طرف جو ماہ ہر [34] خورشید رو کے آج ہوتا ہے
مگر کچھ نور اس مکھڑے سے جا کر وام لے آیا

۸۔ لگا کہنے کہ خط پڑھ کر گئی اک [35] گالیاں دی ہیں
جو میں پوچھا یہ قاصد سے کہ کچھ انعام لے آیا

۹۔ نہ سویا نیند بھر دنیا میں سوز اس دل کے ہاتھوں سے
عدم سے ساتھ [36] میں اپنے میں عجب آرام لے آیا

۱۰۔ زندگانی [37] میں کسے آرام حاصل ہوئے گا
ہائے آسودہ جہاں میں کون سا دل ہوئے گا

۱۱۔ غیر سے مل کیونکہ ہم چشموں سے پھر ہو کے دوچار
آئینے کو [38] منہ دکھانا تم کو مشکل ہوئے گا

۱۲۔ گو کہ رتبہ ماہ کا پہنچا فلک تک کیا ہوا
مہروش میرے کے منہ دیکھو مقابل ہوئے گا

۱۳۔ واہی نہ سمجھ سوز کے پیماں [39] کو تو اے یار
جو تجھ سے کیا عہد سو نرباہ کرے گا

۱۴۔ سوز کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو
واں تجھے کیا تھی کمی یاں تجھ کو کیا درکار تھا

۱۵۔ لہو سا گر پڑا کچھ جس گھڑی عاشق کا دم نکلا
وہ تھا لختِ جگر یا خونِ دل آنکھوں سے جم نکلا

۱۶۔ نکل کر طفلِ اشک آنکھوں سے طوفاں کر چکا آگے
الٰہی خیر اس فتنے [40] کا پھر باہر قدم نکلا

۱۷۔ میں اپنے دل کو اک [41] مدت سے بیت اللہ سمجھتا [42] تھا
بتوں کو دو مبارک باد یہ بیت الصنم نکلا

۱۸۔ فلک کیا کیا دلوں کی آرزوئیں تجھ سے نکلیں، پر [43]
ہمارے دل سے یاروں کی جدائی کا نہ غم نکلا

۱۹۔ ہوئے خلقت [44] میں اس کی قیس اور فرہاد سے لاکھوں
ولیکن سوز سا بھی عاشقوں کے بیچ کم نکلا

۲۰۔ قدرداں [45] بن ہے بہت حال بُرا شیشے کا
ساقیا پہنچ کہ دل آب ہوا شیشے کا

۲۱۔ ہمسری گردنِ محبوب [46] سے رکھتا ہے وہ
سوز اس واسطے گھونٹے ہے گلا شیشے [47] کا

۲۲۔ اے شمع تجھے جن نے کہ [48] پر نور بنایا
ان نے دلِ پروانہ کو پرشور بنایا

۲۳۔ گھر کا [49] جو اٹھائے [50] ہو تم اے شیخ جی یہ بوجھ
جورو [51] کا تمھیں چرخ نے مزدور بنایا

۲۴۔ دیکھ کر جو مر گئے ہیں تیرے پوروں پر حنا
باندھیو ہاتھوں میں جا کر ان کے گوروں [52] پر حنا

۲۵۔ گلزارِ وصل دوست ہے اپنا گُلِ مراد
اے سوز [53] یوں چنوں کہ صبا کو نہ ہو خبر

گویا علی ابراہیم خان نے سوز کے ۱۹۷ اشعار منتخب کیے تھے، لطف کے گلشنِ ہند میں ۱۳۷ اشعار کا انتخاب درج تھا جب کہ مطبوعہ گلشنِ ہند کے مرتبین نے ان میں سے بھی ۲۵ اشعار کم کر دیے اور باقی محض ۱۱۲ اشعار بچے۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ گلشنِ ہند کی موجودہ مطبوعہ صورت ناتمام ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کا سارا متن، موجود خطی نسخوں کی مدد سے ازسرِ نو مرتب کیا جائے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ اشاعتِ اول کے سرورق پر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ یہ تذکرہ لطف نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر گلزارِ ابراہیم سے اضافوں کے ساتھ ۱۸۰۱ء میں تصنیف کیا۔ ۱۹۰۶ء کا یہ نسخہ دارالاشاعت پنجاب کے رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور میں چھپا۔ (دیکھیے: لطف، مرزا علی گلشنِ ہند عکسی اشاعت لکھنو: اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء صفحہ 'پ')

۲۔ میرامن دہلوی گنجِ خوبی دہلی: شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۶ء ص۴ بحوالہ رشید حسن خان (مرتب) باغ و بہار لاہور نقوش ۱۹۹۲ء مقدمہ ص۴۳

۳۔ باغ و بہار کی ایک حالیہ اشاعت میں اس کا اوّلین سنہ اشاعت ۱۸۰۳ء بتایا گیا ہے، دیکھیے: سہیل عباس خان، ڈاکٹر (مرتب) باغ و بہار مصنفہ میرامن دہلوی ملتان: بیکن بکس ۲۰۰۶ء ص ۳۴۔ جب کہ رشید حسن خان نے پہلے ایڈیشن کا سالِ طباعت ۱۸۰۴ء لکھا ہے محولہ بالا ص ۱۹

۴۔ گلشنِ ہند محولہ بالا ص ۱۵۲

۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر شعرائے اُردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب ۱۹۶۸ء ص ۵۲

۶۔ (I) زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری (مرتب) تذکرہ گلزارِ ابراہیم مع تذکرہ گلشنِ ہند علی گڑھ: مطبع مسلم یونیورسٹی ۱۹۳۴ء ص ۴۱

(II) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کراچی: انجمن ترقی اُردو ۱۹۹۸ء ص۱۹۴

۷۔ علی ابراہیم خان خلیل تذکرہ گلزارِ ابراہیم در معاصر ۲۸۔۲۹ مرتبہ کلیم الدین احمد پٹنہ: دائرہ ادب ۱۹۷۴ء ص ۲۸۴

۸۔ گلشنِ ہند محولہ بالا ص ۵

۹۔ گلشنِ ہند اشاعتِ اوّل مع مقدمہ لاہور رفاہِ عام سٹیم پریس ۱۹۰۶ء ص ۲۴

۱۰ ایضاً جائے مذکور
۱۱ اب یہ مضمون قاضی صاحب کی درج ذیل کتاب میں شامل ہے: عبدالودود، قاضی شعرا کے تذکرے پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۹۵ء
۱۲ قاضی عبدالودود محولہ بالا ص ۱۳۶
۱۳ ان تینوں خطی نسخوں کے تفصیلی تعارف کے لیے دیکھیے: افسر صدیقی امروہوی وسید سرفراز علی رضوی مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۶۵ء جلد اول ص ۱۲۳ تا ۱۳۰
لیکن پہلے خطی نسخے کے تعارف میں ترقیمے کی عبارت نقل کرتے ہوئے مرتبین سے سہو ہوا ہے اور انھوں نے یہاں سنہ ۱۲۱۳ھ لکھ دیا ہے (دیکھیے ص ۱۲۶) جب کہ درست سنہ ۱۲۴۳ھ ہے۔
۱۴ گلشنِ ہند محولہ بالا ص ۱۱۳، ۱۱۴
۱۵ زور، محولہ بالا ص ۱۵۱ عطا کاکوی، سید شاہ عطاء الرحمٰن (مرتب) تذکرہ گلشن و گلزار یعنی گلشنِ سخن و گلزارِ ابراہیم تلخیص و ترجمہ پٹنہ ادارہ تحقیقاتِ عربی دفارسی ۱۹۶۸ء ص ۷۲
۱۶ الیاس الاعظمی، ڈاکٹر محمد تذکرہ گلشنِ ہند اور علامہ شبلی نعمانی (مضمون) در ہفت روزہ ہماری زبان دہلی انجمن ترقی اُردو ۲۲ تا ۲۸ رجنوری ۲۰۰۵ء جلد ۶۴ شمارہ ۴ ص ۲
۱۷ مشفق خواجہ جائزہ مخطوطاتِ اُردو لاہور مرکزی اُردو بورڈ ۱۹۷۹ء جلد اوّل ص ۱۰۷۶ تا ۱۰۹۱
۱۸ اکبر علی بیگ، ڈاکٹر مرزا مرزا علی لطف حیات اور کارنامے حیدرآباد ادارہ شعر و حکمت ۱۹۷۹ء ص ص ۱۳۰۔۱۴۱
۱۹ ایضاً ص ۱۴۲
۲۰ زور، ڈاکٹر سید محی الدین قادری محولہ بالا ص ص ۵۰۔۵۱
۲۱ ایضاً ص ۱۵۱
۲۲ گلشنِ ہند، مطبوعہ لکھنو محولہ بالا ص ۱۱۴
۲۳ ثمینہ شوکت، ڈاکٹر (مرتبہ) مثنوی لطف موسوم بہ نیرنگِ عشق حیدرآباد دکن تحقیقاتِ اُردو ۱۹۶۲ء ص ۲۰

۲۴۔ جائے مذکور

۲۵۔ زاہد منیر عامر سیر سوز۔ سوانح اور شخصیت لاہور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ۲۰۰۰ء ص ۸۳

۲۶۔ مختار الدین احمد (مرتب) گلشنِ ہند تذکرۂ شعرائے اُردو از سید حیدر بخش حیدری دہلوی دہلی علمی مجلس ۱۹۶۷ء

۲۷۔ ایضاً ص ۲۶

اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نسخہ حیدری کا برٹش میوزیم لندن والا قلمی نسخہ ترجمہ سوز پر ختم ہوجاتا ہے باقی متن آکسفورڈ والے نسخے میں موجود ہے (جس کی تفصیل حیدری کی تمہیدی تحریر میں بھی ملتی ہے، ڈاکٹر مختار الدین احمد کے دیباچے میں یہ تمہید غائب ہے......؟) یہ ممکن ہے کہ باقی ماندہ حصہ لکھنا شروع کیا تو پہلے منقول حصے کا آخری ترجمہ دوبارہ لکھا گیا ہو اور یہ خیال نہ کیا گیا ہو کہ پہلے اسی شاعر کا نام کچھ اور لکھا جا چکا ہے۔

۲۸۔ مضمون میں اشعار کا متن ہم نے اپنے مرتبہ کلیاتِ میر سوز (جلد اوّل، مجلس ترقی ادب لاہور) کے مطابق رکھا ہے۔ جن تین خطی نسخوں ع (مکتوبہ ۱۲۴۳ھ) ب (بلا تاریخ نسخہ) اور ق (مکتوبہ ۱۲۵۴ھ) کے اختلافات ذیل میں درج ہیں ان کا تفصیلی تعارف مضمون میں کروا دیا گیا ہے۔

۲۹۔ پہلا شعر دیوانِ سوز کے کسی معتبر قلمی نسخے میں موجود نہیں۔

۳۰۔ ع، ب: قاب دو قوسین

۳۱۔ ق: یک

۳۲۔ ق: توبہ

۳۳۔ ق، ب: کرتے ہیں جو

۳۴۔ ق: اُس

۳۵۔ ع، ب، ق: یک

۳۶۔ ع، ب، ق: اپنے میں

۳۷۔ ع: زندگی میں کس طرح

ق: زندگی میں کیسے......کذا

۳۸؎ ع، ب، ق: آئینہ تک

۳۹؎ ع، ب، ق: پیمان کو اے یار

۴۰؎ ع: فتنہ

۴۱؎ ب، ق: یک مدت

۴۲؎ ع: سمجھا

۴۳؎ ع: نکلی ہیں

ب: نکلیں ہیں

۴۴؎ ع، ب، ق: قدرت

۴۵؎ یہ شعر ع میں نہیں

۴۶؎ ق: کہ اس محبوب (کذا)

۴۷؎ ع: شیشہ کا

۴۸؎ ق: کے

۴۹؎ ق: سر پر

۵۰؎ ع، ب، ق: اٹھاتے

۵۱؎ ق: حورو[ں]

۵۲؎ ع، ب، ق: کوروں لیکن یہ محض املائی فرسودگی بھی ہو سکتی ہے۔

۵۳؎ ع، ب، ق: اے یار

دل کی نہ دیکھا موں نہ کبھی انگور کا ٭ رطوبت داغ دل سیہی کی ہی گرداب آتش کا ٭ فسون عشق نے

زہر اگیا ہی آب آتش کا ٭ نہ پہنچا میری اینک کرم سی آسیب شرر کا تکو ٭ ہے خاشاک کی سایہ تلی سیلاب

آتش کا ٭ جہنم سی ڈراتا کیا ہی میخوار و نکو ای زاہد ٭ کہ چوب خشک سی بہتر نہیں ہی باب آتش کا ٭ ہوئی ای

رنگ پر میری پچھو کیونکہ ابی ٭ جلی ہی داغ دل ایسا کہ جون حباب آتش کا ٭ تو ہی ای یار آتش سن اب

شور نمک اس پہ چھاتی کا ٭ سینہ و داغ سین ہی ربط دیا باتی کا ٭ کیونکہ وہ شوخ لکہی مجکو کتابت جنی کہیں ہی

ہند عی میری چہوڑ دیا پاتی کا ٭ آہ کس طرح کجہی راہ دین کہیرون کر کو ہی ٭ ستارہ ہونکی عمر جلی جاتی کا

یہ گیا شیخ نی شیطان سی کہ اہم سی مل ٭ آشنا مت ہو تو سودا سی خراباتی کا ٭ کہا اونے

کہ اہی میری تو سعادت اسین ٭ لیک ہی خوف مجہی آپ کی نہ دوانیکا ٭ جکبہہ تہی دلکو تیری دین ملمین

ایک زمانا تہا ٭ میری ہی شیشہ کو اس سنگ مین ٹھکانا تہا ٭ جی میرا مجہ سی یہہ کہتا ہی کہ مل

جاونگا ٭ بات سی دل کی تری اب مین نکل جاونگا ٭ لطف ای اشک کہ جیون شمع کہلا جاتا ہوں

رحم ای آہ شرربار کہ جل جاونگا ٭ چہیڑ مت باد بہاری کہ مین جون نکہت گل ٭ پہاڑ کر کپڑی ابہی گھر سی

نکل جاونگا ٭ [illegible] سید میر نام ساکن قراول پور شاہجہان آباد ٭ سید عالی نصب اور فن

سخن وری مین استاد طرز ادا یکی بادشاہ اور صورت مضمون درد و آہ تہی کلام انکا

گلشنِ ہند کے خطی نسخے مکتوبہ شانزدہم جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ میں ترجمۂ سوز کا متن

ربط کے لیے دیکھیے صفحہ نمبر ۴۳

سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے اور پانو سے نغمۂ نالہ و نیاز شعر کے کہنے میں اسلوب
طرز خاص تھی اور آئین محبت میں پایۂ مروت و اخلاص علم سر بلند کیا ہوا بدر کدہ ریختہ میں تنبیہ
دل آشنا رکھتے تھے اور حسن شقہ نویسی میں نہایت دست رسا رکھتے تھے خواہ نخواہ تھوڑی باتیں
تمام وصل کی ایام زندگی کو صرف نشہ بیکار کیا اور سنہ اٹھارہ سو میں جلوس شاہ عالم بادشاہ
غازی کے وارستہ مزاجی تکلیف سے لباس فقر اختیار کیا لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے اور
اوقات ساتھ توکل و قناعت کے بسر کرتے تھے سنہ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشدآباد تک تشریف
لائے لیکن اطوار سکونت کی وہاں کچھ نظر آئے اور سال بھر لکھنؤ تشریف لے گئے اور اس
دار فنا سے راہی ملک بقا کی ہوئے علی ابراہیم خان مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ جس
سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چند فقرہ نثر لکھ کر مجھے بھیجے
تا کہ داخل تذکرہ کروں چنانچہ ایک دو فقرہ میر مذکور کی نثر کا یہی خان مسطور نے تذکرہ میں
لکھا ہے ترجمہ اسکا زبان ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے کہ جو شے حق سبحانہ تعالی نے مخلوق کی ہے
بلکہ جتنے خار و خس ہیں کسی نہ کسی کام آتے ہیں اور بندگان خدا اونسے فایدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ بعض خود
شخص ہیں کہ کسی کو اسے حلاوت نہیں ہوتی ہے سوائے سکونت اور کراہیت کے سبحان اللہ بہت ہی عبرت

دو چار آئینہ تک سو نہ دکھا، تمکو مشکل ہوئیگا ۔ قتل سے ہے یکبارگی راضی ہے اپنی اس لیے ہاتھ
ہیں اگر در ہو دامان قاتل ہوئیگا ۔ ابر کی قطرہ بھی ہو جاتی ہیں ۔ دیتی ناصحا کیا ہیں رونے
سے اپنی کچھ حاصل ہوئیگا ۔ گو کہ رتبہ ماہ کا پہنچا فلک تک کیا ہوا ۔ مہروش میری کے مونہہ دیکھو تو قابل
ہوئیگا ۔ ور گذر اس خون سے آخر بھی دیکھا زخم [illegible] کا دل جگر کی خنجر سے بسمل ہوئیگا ۔ کعبہ ہی کا
اب قصد یہ مرا کر ئیگا ۔ جو تمنا یہاں ہو کا سو ادا کر ئیگا ۔ زلفوں سے پڑا طول ہیں اب عشق کا جھگڑا
خطان کی یہ مجملہ کو تا کری گا ۔ واہی سمجہ کر کی سماں کو اے یار ۔ تو تجہ سی کیا عہد سو زیادہ کری گا
اپنی رو نہیں گرا اثر ہوتا ۔ قطرہ اشک سے گہر ہوتا ۔ جستجو یار میں تھکتی ہیں تجہ تک کاش میں
ہوئیکا نامہ بر ہوتا ۔ پھر کہتا کسی سے اگر ۔ حال میری سے باخبر ہوتا ۔ خون عاشق کرے کیوں
ناحق گر تو تمکو خدا کا ڈر ہوتا ۔ کو عشق کعبہ جا نکلا ۔ ہے ہیبت سا زیادہ تر ہوتا ۔ اگر میں
جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا ۔ تو محشر تک نلیتا نام ہرگز آشنائی کا ۔ نہ پہنچا آہ و نالہ کو
تک اوس کی گھر آنا سماں ہم کیا کریں طالع کی اپنی نارسائی کا ۔ جدا یا ک کی ہم بندی کہاں ہیں سمت
مشکل ہے رکھی ہی ہر قسم اس دہر میں دعوا خدائی کا ۔ خدا کی بندہ گیا [illegible] یا دعوی تو خلیفہ کی
دلیا ویکہا جنسی بند ہی اپنی خود نمائی کا ۔ قاضی ہزار طرح کی تصنیف سکا لیکن نہ حسن و عشق کا

جہڑا چکا سکا ۔ قاصد ہو طفل اشک کئی بار ہا دلی ۔ دل کی خبر کوئی نہ تیری کو سی لا سکا
کیا فایدہ ہی یاروں سی ای چشم زار کی ۔ کب اشک دل کی آگ لگی کو بجہا سکا ۔ رستم نی کوہ بار
اوٹہایا تو کیا ہوا ۔ اوسکو بشر ہی جو تیرا نازا اوٹہا سکا ۔ ای عزم کوچہ قاتل نکر عبث تو
ایک ہی بتا دی کہ وہاں جا کے آئیگا ۔ خطرہ نہیں ہی مجہ کو ای عشق اپنی جیکا ۔ تونی
خضاب کہا جب سی ہا دری کا ۔ ہر صبح مونہہ چڑہایا ہی اوس تندخو کی اوٹہ کر کہا اپنی
کلیجا دیکہو ہی آریگا ۔ کہتا نہیں مین ای دل اس کام سی تو باز آ ۔ دیکہا ذرا نہ تونی ناداں عاشقی کا ۔
عارض کو تیری پہنچی کب اوسکی چہرہ ہا ہنسا ۔ ہا رہی ہزار ہو تو ہی گل کا رنگ ہی کیا ۔ رستم تو
آج تو ہی میدان کی بحر کا ۔ ای ... کسکو دعوی ہی کہ تجہ سی ہمسر کا ۔ تجہ پہ قربان ہی جان
و مال و دین میرا ۔ اکبار ہی تو تس فسانہ رنگین میرا ۔ ہوئی گل شاخ ہو امین جیسی لیتا ہی چمن ۔
کس قدر غنچہ ہی انسہ پہ گلچین میرا ۔ زلفوں سی اگر مجکو سر و کار نہوتا ۔ یہانتک تو پریشان
یہہ دل زار نہوتا ۔ خو کر جو ہدا وی سی طبیب اپنی کو جاتا ۔ تو زیست سی مایوس یہہ بیمار نہ ہوتا ۔ گر آنکہہ
انکی نہ کسی شوخ سی جا کر ۔ تو دل ہی کہیں گرفتار نہوتا ۔ اکدن ایک شخص نی آ کی کہا
تونی تو یہہ ذکر سنا ہوگیا ۔ یعنی عاشق ہی تیرا جی سی مجہ ... ستم یہہ کیا ہوگیا ۔

بلبل نہ

بلبل نے جب کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا ۔ دو آنکھ موند منے وہ من ہی میں دیکھا ۔ خورشید آوے

جیسے ہر بنت کی اندر ۔ عاشق کو تیری جلتی یوں سر میں دیکھا ۔ یوں دکھنی سیں میری

کیا نہ ہندو سیکو دیکھا اونین نے تجکو جیتی بچن میں دیکھا ۔ اس سوں آکھو جو نہ پایا تری دیوانگا

قطرہ جو اوں ہی بکر جار بیا یا نکا ۔ کسی طرح تری دل ہی حجاب نکلی کا ۔ میری سوال کا

مونہہ سیں جواب نکلی کا ۔ نکلنے کا نہیں سینے سیں دل جو دو مونہ دیکا ۔ جو نکلی کا تو جلا سا کباب

نکلی کا ۔ ہی جیتی جی تو مجھی کوئی یار بار میں رونا ۔ رہیگا مرگ کی بعد از مزار میں رونا

جو جھبت کے رات کو شبنم چمن میں روتی تو کیا ۔ ہے مجھی تو ایک سیں لے تا ہزار میں رونا ۔ ہم

خزاں کا مجھی نے بہار کی شادی ۔ حرامین خاک ہی سر پر بہار میں رونا ۔ تو رو ورد و عمل تو

ای دو ابنی آنسو بوجہ ۔ اپنی بہت ہی تجھی بحر یا میں رونا ۔ جو نکلی عشق سیں ای واللہ

کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ انہوں سیں بات کرنیکو ہی ایتے دل نہیں ہوتا ۔ انکو جیسی ادہم

کٹھن دیکھتا ۔ اونسی مجکو دل پر غم بخشا ۔ ساغر عیش دیا اور ونکو ۔ کو دیدہ

پرنم بخشا ۔ جیسی ہر درد کو درمان بخشا ۔ ہمیشہ سیکا ذکر ہی ایمان بخشا ۔ لی نیاز ہی

تو میاں عشق کی دیکھو ۔ کو ہی چاک گریبان بخشا ۔ جیسی معشوقوں کو ذی عیاری کیا ۔ بیہودہ

کریان بخت نور کیون آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا مین تو ہ وہان کچھی گیا تھی کیا یہان کچکو

کیا درکار تھا ولا یوسا کر پڑا کچھ جگہڑی عاشق کا دم نکلا ہ وہ تھا لخت جگر یا خون دل آنکھون

سی جم نکلا ہ نکل کر طفل اشک آنکھون سی طوفان کر چکا آگی ہ اٹھی حیرت اس سر کا جہان ہر قدم نکلا

مین اپنی دلکو اکیدرت سی بت اللہ سمجھا تھا ہ تمہو نکو و مبارکباد یہہ بیت الصنم نکلا ہ فلک گیا تیا

دلوکی آرزو نین تجہ ہی نکلی ہین ہ ہماری دل سی یارون کے جدائی کا نغم نکلا ہ موی قدرت مین

اوسکی قیامس و دنیا دیکھی ہین لا کیون ہ ولیکن نہ سا ہی عاشقون کے بیچ کم نکلا ہ ہمسری کر دن محبوب سے

کہتا ہی و نور اس اسطی کہو منہی ہی گلہ شہنکا ولہ ای شمع تجھی جنبی کی پر نور بنایا ہ

اون نی دل پروانہ کو پر شور بنایا ہ کہرکا جو اوٹھاتی ہو تم ای شیخ جی یہہ تو جہہ جو ہزار کا

تمہین چرخ نی مزدور بنایا ولہ غم تو کہتا ہی کہ مین تجکو ستا جاؤنگا مر مری جان تیری

غم کو مین کہا جاؤنگا ہ ہم غریبون کی کہر آئیگا کہان تجہ کو دماغ ہ نت کرو وعدہ عبث

ہم ہی گرا آونگا ہ اسطرح جی دون کہ تو رحم ہی نوبلی صد حیف ہ ہم نی غش سی جدان اوٹھا جاؤنگا

باغبان فکر نکر تو میری ویرانیکا ہ آشیان آتش گل سی مین جلا جاؤنگا ہ نی جکہا ہ لکو

غلط ایسا جہان جو مالکی ہی خیال نور کہتا ہی یہہ کو لی تو کہا جاون کا ہ ذلہ کل ہی نہین غلام

تیرے کا

دوست سے اپنا کمل مراد ای یار یوں ہوں کہ صبا کو بہو خبر اب ضرر کرنے لگا دل کو بتاں کا اختلاط

سچ تو ہے ان بیوفاؤں سے کیا ہے ان کا اختلاط ۔ اب کوئی دم کو بچاوے کی خزاں یہاں آگئی ہو غنچہ بلبلو

چھوڑ دو تم گلستان کا اختلاط ۔ اٹک کب ہوں تیری ستانی کی خٹک ۔ کو چہ کب ہوتی ہیں پنہاں کے خٹک

چوری چوری یا منہہ تیری شاید لگا ہونٹ کچھ بھی دہب میں پیمانہ کی خٹک ۔ زلف کی تیوہنی کیا

جا کر دیہا یا الہی ہاتہہ ہوں شانہ کی خٹک ۔ گڑا ہیں سنگ سے سر ہو ہم کنار ہم تم رو نیا

کلی ہی لگ کر ای آپ ہم تم ۔ میرا بھی یہ وجہ سے یا سرکشی ہوا قمری ۔ نالی کریں نہ کیجا ہیں تسبو گو ہم تم

دیکہیں تو جو داغ سینہ کسکی ہیں اب زیادہ ۔ اتی داغ دل کی گر لیں شمار ہم تم ۔ مو تیری دلکو دیکہہ اور میں تیری

دلکو دیکہوں ۔ دل چاک چاک کر کر دیکہیں بہار ہم تم ۔ تم تو چلی گئی پر یہہ ۔ ہی اکیلا ای بیمری درد صاحب

تہی یادگار ہم تم ۔ سجاد اکبرآبادی میر سجاد نام وطن بزرگوں کا انکی آذربائیجان ہے لیکن تربیت

انہوں نے شاہجہان آباد میں پائی ہے اور شاگرد ہیں شاہ نجم الدین آبرو کے کیفیت طرز ایہام

اوٹہائی ہے کلام میں انکی ایہام شاہ صاحب مذکور سے بھی زیادہ ہے سچ تو یہہ ہے کہ اپنی وضع کا یہہ عزیز

ہی استادوں میں ہے میر محمد اکرم خان واوا انکی دار الانشاء بادشاہی میں نواب یحیی خان میر

منشی کے ہمراہ تہی بہت مرد سنجیدہ ادر حقیقت اکا تہی غرض بزرگ صاحب دیوان ریختہ ہیں
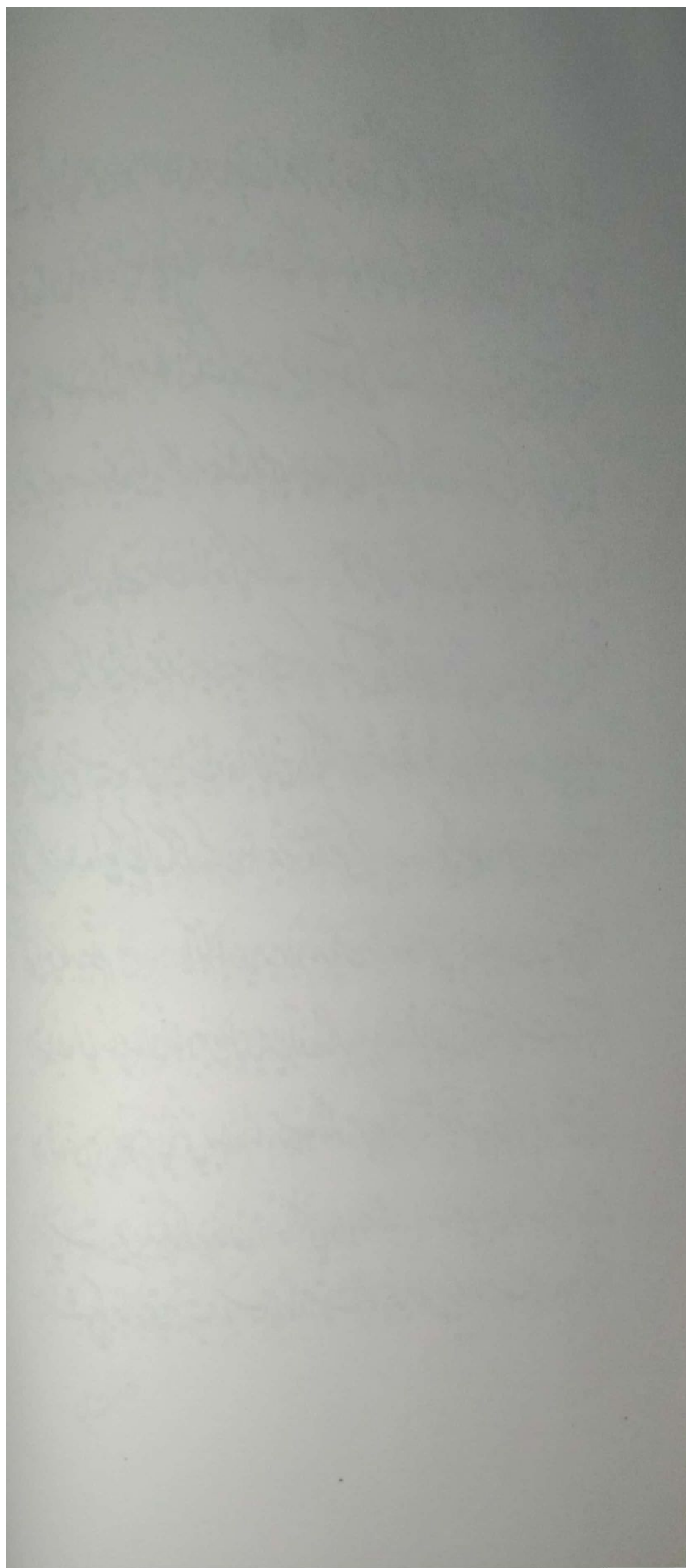
علومِ مشرق کا ایک پاسبان......اورینٹل کالج

۱۸۵۴ء میں برطانوی حکومت نے پہلی بار برِّعظیم پاک و ہند کے مختلف صوبوں میں محکمہ ہائے تعلیم اور لندن یونیورسٹی کی طرز پر کلکتہ (اب کولکتہ)، مدراس اور بمبئی (اب ممبئی) میں تین یونیورسٹیوں کے قیام کا فیصلہ کیا۔ صوبہ پنجاب کو کلکتہ یونیورسٹی کے حلقۂ اثر میں رکھا گیا لیکن ۱۸۵۶ء میں پنجاب میں محکمہ تعلیم کے قیام اور دو برس کی قلیل مدت میں سات سو سکولوں کے اجرا، تربیتِ اساتذہ کے لیے لاہور، راولپنڈی اور دہلی میں نارمل سکولوں کے قیام اور ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے قیام سے جلد ہی یہاں کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کا اندازہ کیا جانے لگا۔

۱۸۶۴ء میں مشہور مستشرق، کنگز کالج لندن میں عربی اور مسلم قانون کے پروفیسر ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (۱۸۴۰ء۔۱۸۹۹ء) گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بن کر لاہور

آئے جن کی سرکردگی میں اگلے ہی برس ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے مقاصد میں قدیم مشرقی علوم کا احیا اور باشندگانِ ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علومِ مفیدہ کی اشاعت سرِ فہرست تھے۔ اسی انجمن کے اگست ۱۸۶۵ء میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں دیسی زبانوں کی ترقی اور مشرقی علوم کے احیا کے لیے ڈاکٹر لائٹنر نے ایک اورینٹل یونیورسٹی کا تخیّل پیش کیا جسے بعد ازاں ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر ڈانلڈ میکلوڈ کی صدارت میں ہونے والے ایک اجلاس میں باقاعدہ تجویز کی صورت دے دی گئی۔ مرکزی حکومت، پنجاب کو ایک مستقل یونیورسٹی دینے میں متردّد تھی۔ لیکن یہاں کے گورنر مسٹر میکلوڈ، کمشنر لاہور مسٹر برانڈرتھ اور ڈپٹی کمشنر مسٹر سی۔ یو ایچی سن کی مساعی کے نتیجہ میں مرکزی حکومت نے بالآخر پنجاب کی تعلیمی ضروریات اور کلکتہ یونیورسٹی کے طریقِ کار کی پنجاب کی ضروریات سے عدم مطابقت کو تسلیم کرتے ہوئے محدود پیمانے پر ایک کالج کے قیام پر رضامندی ظاہر کی جسے پنجاب یونیورسٹی کالج کا نام دیا گیا۔ اور اسے صرف اسناد کے اجرا کی اجازت دی گئی۔ ڈگریوں کے اجرا کا اختیار اب بھی کلکتہ یونیورسٹی کے پاس رہا اور دیسی زبانوں کے ذریعے یورپی علوم وفنون کی اشاعت، السنہ و ادبیاتِ شرقیہ کی تعلیم اور تعلیمِ عامہ کی نگرانی، اس کالج کے فرائض مقرر کیے گئے۔

انجمنِ پنجاب نے اپنے قیام کے پہلے ہی سال ۱۸۶۵ء میں مدرسۂ علوم مشرقی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس میں عربی فارسی اور اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ لیکن یہ ادارہ بوجوہ ۱۸۶۸ء میں بند کر دیا گیا تھا۔ اب جب ۸ دِسمبر ۱۸۶۹ء کو پنجاب یونیورسٹی کالج کا اجرا ہوا اور علوم والسنہء شرقیہ کی اشاعت اس کا فریضہ قرار پائی تو اسی طریقِ کار کے تحت ۱۸۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج کا پہلا باقاعدہ تدریسی ادارہ،

مدرسۂ علومِ مشرقی کے نام سے قائم کیا گیا اور ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر اس کے پہلے پرنسپل مقرر کیے گئے۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں اس ادارے کو کالج کا درجہ دے کر اس کا نام اورینٹل کالج رکھ دیا گیا اور تدریس علوم والسنہ کے ساتھ ساتھ تحقیق وتصنیف اور طباعت واشاعتِ کتب کے فرائض بھی اس نئے ادارے کے مقاصد قرار دیے گئے۔

چونکہ اس ادارے کے قیام میں پنجاب کے امرا، رؤسا اور انجمنِ پنجاب نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور مرکزی حکومت، پنجاب پر کلکتہ یونیورسٹی کی بالادستی قائم رکھنا چاہتی تھی اس لیے حکومت نے اس نئے ادارے کو حکومتی گرانٹ سے محروم رکھا، چنانچہ اس ادارے کے اخراجات امرا اور روسائے پنجاب اور عوام کے عطیات کی مدد سے پورے کیے جاتے رہے اور اس نئے ادارے نے مختصر مدت میں کم اخراجات کے ساتھ عمدہ علمی معیار پیش کیا۔

۱۸۷۸-۷۹ء کی سالانہ رپورٹ کے مطابق اورینٹل کالج کے عملے نے تدریسی ذمہ داریوں کے علاوہ دو برس کے عرصہ میں پچاس کتابیں تحریر کیں۔ عربی اور سنسکرت کے ماہوار علمی جرائد ان کے علاوہ تھے۔

ڈاکٹر لائٹنر، جن کے تخیّل اور مشرقی ومغربی علوم کے امتزاج کی خواہش کے نتیجہ میں پنجاب کو یونیورسٹی کالج کا کم اختیار ادارہ ملا تھا یہاں ایک مکمل یونیورسٹی کے قیام کے لیے کوشاں رہے۔ چنانچہ بالآخر اکتوبر ۱۸۸۲ء کو اہلِ پنجاب کو بھی ایک مکمل یونیورسٹی مل گئی۔ یونیورسٹی کے قیام پر کالج کو مشرقی علوم، قانون، آرٹس، سائنس ادویات اور انجینئرنگ کی مختلف فیکلٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اورینٹل کالج کے حصہ میں مشرقی زبانوں، میڈیکل سکول، طبِ یونانی اور آیوویدک کے شعبے آئے۔ یہاں کا تدریسی معیار رفتہ رفتہ بلند تر ہوتا گیا اور ٹریننگ کالج اور وٹنری کالج کے طلبہ بھی یہاں ہونے والی نیچرل سائنس فیلو کی

جماعتوں میں شرکت کے لیے آنے لگے۔

۱۸۸۶ء میں ڈاکٹر لائٹر کی مراجعت کے بعد یہاں کے ماحول میں کچھ بدنظمی پیدا ہونے لگی چنانچہ ۱۸۸۸ء کی ایک سب کمیٹی کی تجویز پر انجینئرنگ کی کلاسیں میو اسکول آف آرٹس میں منتقل کر دی گئیں۔ البتہ طب یونانی اور آیوویدک کی کلاسیں اساتذہ سمیت میڈیکل سکول میں منتقل کر دی گئیں۔ اسکول کی بعض جماعتیں اور عربی، سنسکرت اور گورمکھی میں عالم اور فاضل کی کلاسیں جاری رہیں۔ اسی سلسلہ میں انگریزی کی دونئی کلاسوں کا بھی اجرا کیا گیا۔ عربی اور سنسکرت میں نہ صرف بی او ایل اور ایم او ایل کی جماعتیں جاری رہیں بلکہ ۸۹۔ ۱۸۸۸ء میں ان زبانوں میں ایم۔ اے کی جماعتوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ انٹرنس، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے سلسلے بھی بدستور جاری رہے جن میں گورنمنٹ کالج کے مشرقی زبانوں کے طالبِ علم بھی شریک ہوتے تھے۔

۱۱۔۱۹۱۰ء کے تعلیمی سال میں مختلف مصالح کے تحت اورینٹل کالج سے سکول کا شعبہ ختم کر دیا گیا۔ سکول، بی او ایل اور ایم او ایل کی کلاسوں کے خاتمے کے بعد اورینٹل کالج میں ایم اے (سنسکرت) ایم اے (عربی) شاستری بشادر، مولوی فاضل، مولوی عالم، منشی فاضل، منشی عالم، گیانی (گورمکھی) بھائی (گورمکھی) اور انگریزی (میٹرک) کے تدریسی شعبے باقی رہ گئے۔ ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ کالج کی آرٹس کی جماعتوں کا سلسلہ اورینٹل کالج سے منتقل ہو گیا۔ البتہ مقامی کالجوں کی ایم اے عربی اور سنسکرت کی جماعتیں اورینٹل کالج میں ہونے لگیں۔

بعد ازاں ایم اے فارسی کا اجرا ہوا اور ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ انگریزی کی شام کی کلاسیں بھی شروع کر دی گئیں۔ جزوی کلاسوں کا یہ سلسلہ ترقی پذیر رہا اور رفتہ رفتہ اردو، ہندی

، پنجابی، عالم فاضل کی کلاسیں شام کو بھی جاری کر دی گئیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے میں فاضل کلاسوں کے طالب علموں کو جزوی طور پر عربی، فارسی سنسکرت اور جنرل نالج بھی پڑھائے جاتے تھے۔

اسی زمانے میں یہاں پی ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ کی سطح کا تحقیقی کام بھی شروع ہوا اور ۱۹۱۳ء میں مسٹر این بی کھارے کو ڈاکٹر آف میڈیسن کی پہلی ڈگری عطا کی گئی۔

تقسیمِ برصغیر تک تعلیم و تدریس کی یہ شمع یونہی روشن رہی۔ ۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی کے موقع پر بہت سے غیر مسلم اساتذہ کے پاکستان سے ہجرت کر جانے کے باعث ہندی، سنسکرت اور گورمکھی کے شعبے معطل ہو کر رہ گئے۔ البتہ عربی فارسی اور اردو کے شعبے بدستور قائم اور روبہ ترقی رہے۔ ۱۹۴۸ء میں اردو میں ایم اے کی کلاسوں کا آغاز ہوا اور ۱۹۴۹ء میں ادیب فاضل اور ادیب عالم کی کلاسیں بھی شروع ہو گئیں۔ علاوہ ازیں بعض مشرقی اور مغربی زبانوں مثلاً فرانسیسی، جرمن، روسی، ہسپانوی، ترکی، عربی، فارسی اور جاپانی ڈپلوما اور سرٹیفیکیٹ کی کلاسیں بھی شروع کر دی گئیں۔

۱۹۵۴ء میں جب عالم اور فاضل کے امتحانات سیکنڈری بورڈوں کے سپرد کر دیے گئے تو اورینٹل کالج سے عالم اور فاضل کلاسوں کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی جگہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں بی اے آنرز (عربی) کی نئی کلاسیں جاری ہوئیں۔ ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی کے ایک فیصلے کی رو سے اورینٹل کالج میں ایک لینگویج یونٹ قائم کیا گیا جس کے تمام تر اساتذہ غیر ملکی تھے اس یونٹ کے تحت لسانیات و صوتیات کی بھی سرٹیفیکیٹ اور ڈپلومہ کلاسوں کا اجرا ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر یہاں غالب چیئر قائم ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں پنجابی کا نیا شعبہ قائم ہوا جس میں ایم اے کی سطح کی تدریس کا سلسلہ

الگ انتظام کے تحت قائم شعبہ فرانسیسی میں بھی اورینٹل کالج میں شروع کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں ایم اے کی تدریس کا آغاز کر دیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں حضرت سید علی ہجویری لاہوری المعروف حضرت داتا گنج بخش ؒ کی تعلیمات اور افکار کے فروغ کے لیے حضرت علی ہجویری چیئر اور حکیم الامت علامہ اقبال ؒ کی تعلیمات و افکار کی توسیع و اشاعت کے لیے شعبۂ اقبالیات کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ کشمیری زبان، ادب، تاریخ اور ثقافت کے اعلیٰ سطحی مطالعے کے لیے ۱۶ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ایک نیا شعبہ کشمیریات قائم کیا گیا جس میں ابتدائی طور پر سرٹیفکیٹ کلاس، ۱۹۸۳ء میں ڈپلوما کلاس اور ۱۹۸۶ء میں ایم اے کی سطح کی تدریس کا آغاز ہوا۔

عمارت:

اورینٹل کالج کا آغاز لوہاری دروازہ لاہور میں کھڑک سنگھ کی حویلی سے ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں اس کے لیے انارکلی بازار میں کرائے کی ایک عمارت حاصل کی گئی جس کی جگہ بعد ازاں برکت رام بلڈنگ تعمیر ہوئی۔ ۱۸۷۶ء میں اورینٹل کالج کی کلاسیں گورنمنٹ کالج لاہور کی عمارت میں منتقل ہو گئیں اور ایک زمانے تک گورنمنٹ کالج کی عمارت کی بالائی منزل اورینٹل کالج کے تصرف میں رہی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ انتظام دونوں اداروں کی ضروریات کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگا۔ ۱۹۱۲ء میں حکومتِ ہند نے اورینٹل کالج کی عمارت کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم دی جس سے یونیورسٹی نے کونونٹ سکول لاہور کی عمارت خرید لی اور اورینٹل کالج اور لا کالج کو اس میں منتقل کر دیا گیا۔ البتہ اورینٹل کالج کے طلبا کا ہاسٹل بدستور بادشاہی مسجد کے سامنے، حضوری باغ کے کمروں میں رہا۔ کونونٹ سکول کی عمارت کے خستہ اور شکستہ ہو جانے کے باعث اورینٹل کالج اور لا کالج کے لیے نئی عمارات کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ وائس چانسلر سر جان مینارڈ کے زمانہ ریاست میں

۱۹۲۲ء میں لا کالج کی عمارت تعمیر ہوئی اوراس کے بعد تین ہی برس کے عرصہ میں لا کالج کی عمارت کے متوازی ۱۹۲۵ء میں اورینٹل کالج کی عمارت بھی مکمل ہوگئی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو گورنر پنجاب سر ولیم میلکم ہیلی نے اس کا افتتاح کیا۔ بعد ازاں ان دونوں عمارتوں کے درمیان ایک مشترک ہال تعمیر کر کے انھیں باہم ملا دیا گیا اور اس ہال کا نام اس وقت کے وائس چانسلر کے نام پر سر جان مینارڈ ہال رکھا گیا۔ اورینٹل کالج تب سے اب تک اسی قدیم اور باوقار عمارت میں قائم ہے بعد کے زمانے میں جب لا کالج کو نیو کیمپس منتقل کر دیا گیا تو اس کی عمارت بھی اورینٹل کالج کو مل گئی۔ چنانچہ اب یہ تمام عمارت اورینٹل کالج کے پاس ہے اور سر جان مینارڈ ہال کا نام اورینٹل کالج کے نامور استاد اور محقق حافظ محمود خان شیرانی (۱۸۸۰ء......۱۹۴۶ء) کی صد سالہ تقریباتِ ولادت (۱۹۸۰ء) کے موقع پر تبدیل کر کے شیرانی ہال رکھا جا چکا ہے۔

۱۹۱۲ء میں حکومتِ ہند نے یونیورسٹی کے لیے دو لاکھ روپے کی گرانٹ منظور کی جس کی مدد سے ۱۴-۱۹۱۳ء میں یونیورسٹی نے دو لاکھ پچھتر ہزار روپے میں کونونٹ سکول کی جگہ خرید لی، یہی جگہ ہے جس پر اورینٹل کالج اور لا کالج کی مذکورہ عمارتیں تعمیر ہوئیں اور اسی جگہ میں ان دونوں اداروں کے طلبا کی اقامت گاہیں تعمیر کی گئیں۔ ستمبر ۱۹۲۹ء میں اورینٹل کالج کے ہاسٹل کی تعمیر مکمل ہوئی جس میں چوالیس طلبہ کے قیام کا بندوبست تھا۔ اس کا نام کالج کے نامور استاد، پرنسپل اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اے سی وولنر (۱۸۷۸ء-۱۹۳۶ء) کے نام پر وولنر ہاسٹل رکھا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں لا کالج کے لیے بھی ہاسٹل کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ ۲۲۲ کمروں کے اس ہاسٹل کا نام اس وقت پنجاب کے گورنر اور یونیورسٹی کے چانسلر ڈی مانٹ مورنسی کے نام پر ڈی مانٹ مورنسی ہال رکھا گیا لیکن اسے لا کالج ہاسٹل

پہلے اس ہاسٹل کا نام خالد بن ولید ہال رکھ دیا کے عمومی نام سے پکارا جاتا رہا اب کچھ عرصہ
گیا ہے۔ لا کالج کے یہاں سے چلے جانے کے بعد، یہ ہاسٹل بھی زیادہ تر اورینٹل کالج کے
طلبہ کی رہائشی ضروریات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اورینٹل کالج کی طالبات قائداعظم
کیمپس (نیو یونیورسٹی کیمپس) میں واقع طالبات کے ہاسٹلوں میں رہائش اختیار کرتی ہیں۔

اساتذہ:

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کا ایک امتیاز یہ ہے کہ ہر دور میں یہاں اپنے وقت
کے انتہائی فاضل اور نامور علمانے درس و تدریس کے فرائض انجام دیے ہیں۔ آغاز سے
یہاں کے اساتذہ میں علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے ایسے درخشندہ ستارے شامل رہے
ہیں جن پر کوئی بھی ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یہاں درس و تدریس کا فریضہ انجام دینے
والے اساتذہ میں سے چند نامور اساتذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ م م سے مدتِ
ملازمت ہے۔

ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (مدت ملازمت: ۱۸۶۰ء۔ ۱۸۸۶ء)، مولانا فیض الحسن
سہارنپوری (م م ۱۸۷۰ء۔ ۱۸۸۷ء)، مولانا عبدالحکیم کلانوری (م م ۱۸۷۲ء۔ ۱۹۱۶ء)
، پنڈت گورو پرشاد (م م ۱۸۷۲ء۔ ۱۸۹۴ء)، مولوی محمد الدین (م م ۱۸۷۳ء۔ ۱۸۹۸ء)،
مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (م م ۱۸۷۳ء۔ ۱۹۱۷ء)، مولانا محمد حسین آزاد (م م ۱۸۸۴ء۔
۱۸۹۰ء)، مولوی محمد الدین مختار (م م ۱۸۸۷ء۔ ۱۹۲۲ء)، ڈاکٹر سر مارک آرل سٹائین (م م
۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۹ء)، پنڈت سیوادت (م م ۱۸۹۴ء۔ ۱۹۲۶ء)، سر ٹامس آرنلڈ (م م
۱۸۹۹ء۔ ۱۹۰۲ء۔ ۱۹۰۳ء)، ڈاکٹر اے ڈبلیو سٹرائن (م م ۱۸۹۹ء۔ ۱۹۰۲ء)، ڈاکٹر اے۔
سی وولنر (م م ۱۹۰۳ء۔ ۱۹۳۶ء)، ڈاکٹر عظیم الدین احمد (م م ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء)، ڈاکٹر

مولوی محمد شفیع (م م ۱۹۱۹ء۔۱۹۴۲ء)، ڈاکٹر لکشمن سروپ (م م ۱۹۲۱ء۔۱۹۴۶ء)، علامہ عبد العزیز میمن (م م ۱۹۲۱ء۔۱۹۲۵ء)، پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال (م م ۱۹۲۳ء۔۱۹۴۸ء)، سید اولاد حسین شاداں بلگرامی م م ۱۹۲۳ء۔۱۹۳۸ء)، حافظ محمد محمود خان شیرانی (م م ۱۹۲۸ء۔۱۹۴۰ء)، ڈاکٹر بنارسی داس جین (م م ۱۹۲۸ء۔۱۹۴۷ء)، مولانا محمد رسول خان (م م ۱۹۳۵ء۔۱۹۵۴ء)، ڈاکٹر سوریا کانت (م م ۱۹۳۷ء۔۱۹۴۷)، ڈاکٹر محمد باقر (م م ۱۹۴۰ء۔۱۹۷۰ء)، ڈاکٹر عبادت بریلوی (م م ۱۹۵۱ء۔۱۹۸۰ء)، ڈاکٹر عبدالشکور احسن (م م ۱۹۵۱ء۔۱۹۷۵ء)، ڈاکٹر وحید قریشی (م م ۱۹۶۲ء۔۱۹۸۵ء)، ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ (م م ۱۹۶۴ء۔۱۹۹۲ء)، ڈاکٹر محمد بشیر حسین (م م ۱۹۶۴ء۔۱۹۸۳ء)، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (م م ۱۹۵۹ء۔۱۹۸۵ء)، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر (م م ۱۹۶۳ء۔۱۹۹۷ء)، ڈاکٹر سہیل احمد خان (م م ۱۹۶۹ء۔۲۰۰۲ء)، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (م م ۱۹۶۳ء۔۲۰۰۰)، ڈاکٹر آفتاب اصغر (م م ۱۹۷۲ء۔۲۰۰۰ء)۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (م م ۱۹۸۲ء۔۲۰۰۲ء)،

تصنیف و تحقیق:

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کا ایک نمایاں اعزاز یہ ہے کہ یہاں صرف تدریسی امور ہی انجام نہیں دیے جاتے رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کالج کے آغاز ہی سے تصنیف و تحقیق کی طرف بھی بھرپور توجہ کی گئی۔اس ادارے سے منسلک ہونے والے بیشتر اساتذہ صاحبِ علم و فضل اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ان کی انفرادی تصنیفی و تحقیقی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس ادارے نے اجتماعی سطح پر، ٹیم ورک کی صورت میں، تصنیف و تحقیق کی روایت قائم کی۔اس روایت کے آغاز و استحکام میں ان خصوصی ریڈر شپس (Reader ships) کا بڑا دخل ہے۔جن کا سلسلہ کالج کے اوایل ہی سے شروع ہوگیا تھا۔یہ دراصل وہ

وظائف تھے جو مختلف مہاراجوں، نوابوں اور والیانِ ریاست کی طرف سے ادارے کو دیے جاتے تھے اور ادارہ ان وظائف کے ذریعے مختلف سکالرز کو تصنیفی ذمہ داریاں سونپ کر تحقیق کی روایت آگے بڑھاتا تھا۔ میکلوڈ پنجاب عربیک فیلوشپ، میکلوڈ کشمیر سنسکرت فیلوشپ، پٹیالہ ٹرانسلیٹر فیلوشپ، میکلوڈ کپورتھلہ فیلوشپ، جالندھر طبی فیلوشپ، الیگزینڈر فیلوشپ، الفرڈ بہاولپور عربی سکالرشپ، وغیرہ ایسے ہی وظائف کے نام ہیں۔ جن کے تحت مختلف سکالرز نے متعدد موضوعات پر دادِ تحقیق دی اور ساتھ ساتھ اورینٹل کالج کی تدریسی ذمہ داریوں میں بھی ہاتھ بٹایا۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کی عملی زندگی کا آغاز بھی اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربیک ریڈر کے طور پر تقرر سے ہوا تھا۔ (جس پر وہ مختلف وقفوں کے ساتھ ۱۳ر مئی ۱۸۹۹ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء تک مجموعی طور پر کم وبیش سوا دو سال فائز رہے) اور اس زمانہء ملازمت میں انھوں نے واکر کی پولیٹیکل اکانومی (Political Economy) کا ترجمہ کیا اور اردو میں علم الاقتصاد پر پہلی کتاب تصنیف کی۔ یہ دراصل اس تصنیفی و تحقیقی روایت کا تسلسل تھا۔ جس کا آغاز ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹز (۱۸۴۰ء-۱۸۹۹ء) اور ان کے رفقا کے دور سے ہو گیا تھا اور جس میں ہندی، پنجابی اور سنسکرت میں جی ڈبلیو لائٹز، پنڈت گورو پرشاد، آرل سٹائن، پنڈت سیوادت، اے ڈبلیو سٹرائن، اے سی وولنر، بنارسی داس جین، لکشمن سروپ، سوریا کانت اور موہن سنگھ دیوانہ جیسے فضلا نے اور عربی فارسی اور اردو میں ڈاکٹر لائٹز مولانا فیض الحسن سہارنپوری مولانا عبدالحکیم کلانوری۔ مولوی محمد الدین، مولوی محمد شفیع، شادان بلگرامی اور حافظ محمود شیرانی جیسے علما نے اضافے کیے۔

اورینٹل کالج میں تحقیق و تصنیف کی یہ شمع بعد میں آنے والوں نے بھی روشن رکھی اور تلاش و تعیینِ صداقت کی اس روایت میں ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

علامہ عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر رانا احسان الٰہی، ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق، محمد العربی المراکشی، مولانا سید میرک شاہ، مولانا عبدالصمد صارم الازہری، حافظ نورالحسن خان، ڈاکٹر امین اللہ وثیر اور ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے عربی میں جبکہ ڈاکٹر محمد اقبال، عباس ابن محمد علی شوستری، سید وزیرالحسن عابدی، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اکرام اور ڈاکٹر آفتاب اصغر نے فارسی میں اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اردو اور ڈاکٹر شہباز ملک، حفیظ تائب اور ڈاکٹر اسلم رانا نے پنجابی میں گراں قدر اضافے کیے۔ اورینٹل کالج لاہور کی اس علمی روایت سے مرتب ہونے والی تحقیق وتصنیف کی کہکشاں نے تحقیقِ متون، استخراجِ نتائج، لسانی و واقعاتی تسامحات کی نشان دہی اور داخلی و خارجی شہادتوں کے معیار کے مختلف میدانوں میں ایک ایسے دبستان کی تشکیل کی ہے جس کا ہر ستارہ ضوفشاں اور تابناک ہے۔

اورینٹل کالج کے اساتذہ کے گراں قدر تحقیقی و تصنیفی کام نے نہ صرف اس خطے کے علمی معیاروں کو بلند کیا بلکہ یہاں کے اساتذہ کے تحقیقی و تصنیفی کاموں کو بین الاقوامی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا اور بیرونی ممالک میں لکھی جانے والی ادبی تاریخوں، حوالے کی کتابوں اور فہرستوں میں ان کا ذکر کیا گیا۔ ایسے بیرونی مصنفین میں جنھوں نے اورینٹل کالج کے اساتذہ کے تحقیقی کاموں کو سفرِ تحقیق میں معاون بنایا کریس ویل سٹوری، پیرسن، رالف رسل، بارکر، آر۔ ایم ایٹن، ڈی۔ جے میتھوز، سی شیکل، الیگزینڈر بوسانی، این میری شمل، اور ایرج افشار جیسے لوگ شامل ہیں۔

اورینٹل کالج لاہور کی اس علمی روایت کا ایک اہم زاویہ یہاں سے شائع ہونے والے علمی و تحقیقی جرائد ہیں جن کا سلسلہ کالج کے قیام کے فوراً بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ عربی میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی ادارت میں شفاء الصدور کے نام سے اور سنسکرت میں پنڈت رکھی کشین شاستری کی زیرادارت ودیودای (VIDYODAI) نامی علمی رسائل جاری ہوگئے تھے۔ علمی رسائل کی اس روایت نے فروری ۱۹۲۵ء میں اس وقت اپنی معراج کو پالیا جب اورینٹل کالج سے اورینٹل کالج میگزین کا اجرا ہوا۔ یہ میگزین "احیاو ترویجِ علوم شرقیہ کی تحریک کو تاحدِ امکان تقویت" دینے اور نئے تحقیقی شاہکاروں کو متعارف کرانے کے لیے جاری کیا گیا، غیرزبانوں سے مفید تراجم اور نایاب قلمی رسائل کی اشاعت بھی اس رسالے کے اغراض و مقاصد میں شامل کی گئی۔ چونکہ اورینٹل کالج مختلف السنہ شرقیہ کا سنگم تھا اس لیے اورینٹل کالج میگزین میں بھی یہاں پڑھائی جانے والی زبانوں کو بھرپور نمائندگی دی گئی۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اس کے پہلے مدیراعلیٰ تھے جب کہ اس کے عربی، فارسی اور اردو حصوں کے لیے ڈاکٹر محمد اقبال، سنسکرت اور ہندی حصوں کے لیے ڈاکٹر لکشمن سروپ اور گورمکھی کے لیے بھائی بے انت سنگھ ان کے معاون مدیران کے طور پر کام کرتے تھے۔

یہ رسالہ ۱۹۲۵ء سے اب تک زمانے کے بے شمار انقلابات کے باوجود جاری ہے اور اس میں شائع ہونے والے اردو، عربی اور فارسی مقالات کو نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی معیارِ تحقیق کے طور پر سراہا جاتا رہا ہے۔ نومبر ۱۹۳۷ء سے اس کے ساتھ ایک ضمیمے کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جس کی حیثیت انجمنِ عربی و فارسی کے ترجمان رسالے کی تھی۔ طویل عرصے تک جاری رہنے کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہوگیا اب

اورینٹل کالج میگزین عربی، فارسی اور اردو اِن تینوں زبانوں کا ترجمان اور جامع

ہے۔اس کے علاوہ کالج سے مختلف شعبہ جاتی تحقیقی مجلّے بھی شائع ہوتے ہیں جن میں شعبہ

عربی کا مجلہ القسم العربیہ ،شعبہ پنجابی کا کھوج ،شعبہ فارسی کا سفینہ،

شعبہ اردو کا بازیافت اور شعبہ کشمیریات کا سنگر مال شامل ہیں

اورینٹل کالج میگزین کی زمامِ ادارت حسبِ روایت پرنسپل اورینٹل کالج

کے پاس ہوتی ہے۔۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل

لرنگ نے ایک نئے علمی و تحقیقی رسالے مجلہ تحقیق کا اجرا کیا۔یوں نصف صدی

بعد اورینٹل کالج میگزین کو ایک ''بھائی'' مل گیا اور ۱۹۷۹ء کے بعد سے اب تک

یہ دونوں باوقار علمی رسالے تسلسل کے ساتھ شائع ہورہے ہیں۔

اورینٹل کالج کا قیام چونکہ مختلف مرحلوں سے گزر کر عمل میں آیا تھا اس لیے اس کا

جشنِ صد سالہ منانے کا خیال بھی مختلف زمانوں میں ابھرتا رہا۔سب سے پہلے ساٹھ کی دہائی

میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے زمانے میں یہ خیال ابھرا جس کے نتیجے میں تاریخ اورینٹل

کالج لکھی گئی۔۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے زمانہ پرنسپلی میں ایک بار پھر اس

خیال نے کروٹ لی لیکن اب ملکی حالات کالج کا جشن منانے کی راہ میں حایل ہوئے۔تاہم

اس موقع پر چند اہم مطبوعات علمی دنیا کے سامنے آسکیں جن میں ڈاکٹر وحید قریشی کی مرتب

کردہ یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ، ادبی اور درسی

سرمایہ اور ضمیمہ اورینٹل کالج کے اساتذہ ، محققین اور ریسرچ

سکالروں کی فہرست شامل ہیں۔

جون ۱۹۷۲ء میں اورینٹل کالج میگزین کا خصوصی شمارہ شائع کیا گیا اور

اس موقع کی مناسبت سے علومِ شرقیہ کی ایک بین الاقوامی کانگریس کا ڈول ڈالا گیا۔ یہ کانفرنس اگلے سال ۱۲/ مارچ ۱۹۷۳ء سے ۱۷/ مارچ ۱۹۷۳ء کو منعقد ہو سکی۔ جس میں ایران، برطانیہ، ترکی، مصر، امریکہ، سعودی عرب، سوئٹزرلینڈ، سویت یونین اور نیدرلینڈ کے علما نے شرکت کی، یوں کوئی تیرہ برس میں اورینٹل کالج کی صد سالہ تقریبات کا خیال صورت پذیر ہوا۔

سنہ ۱۸۷۰ء کو اورینٹل کالج کے سفر کا آغاز تصور کرتے ہوئے ۱۹۹۵ء میں کالج کی زندگی کے ۱۲۵ سال پورے ہونے کی تقریبات منائی گئیں۔ یہ تقریبات ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی نگرانی میں ہوئیں۔ ۱۹/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو علوم والسنہء شرقیہ سے متعلق ایک بین الاقوامی سیمے نار سے ان تقریبات کا آغاز کیا گیا۔ راقم الحروف نے بھی اس سیمے نار کی بعض نشستوں کی میزبانی کی۔ اس موقع پر بعض کتب اور ایک تعارفی مجموعہ تذکار بھی شائع کیے گئے۔ اورینٹل کالج میں ۱۹۵۹ء میں قائم کیا جانے والا لینگو ایج یونٹ ایک مدت سے ختم ہو چکا تھا، مختلف زمانوں میں یہاں جاپانی، روسی، ترکی زبانوں کے شعبے بھی قائم رہے لیکن اب ایک مدت سے یہ شعبے ماضی کی گرد میں گم ہو چکے تھے۔ ۰۵-۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر مظہر معین کی کوششوں سے (جنھوں نے ۱۶/ جولائی ۲۰۰۲ء کو پرنسپل اورینٹل کالج کا منصب سنبھالا) Department of Asiatic Languages کے تحت جاپانی، روسی اور ترکی کی تدریس بحال کی گئی اور اس کے ساتھ جرمن، روسی، ہسپانوی، چینی، سندھی، بلوچی، پشتو کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا، ہندی کی تدریس پہلے ہی جاری تھی۔ ان زبانوں میں دو سمیسٹر کا ایک ڈپلومہ کروایا جا رہا ہے جس کا پہلا سمیسٹر پرانے سرٹیفکیٹ پروگرام کے برابر اور دوسرے سمسٹر کا نصاب متعلقہ مضمون میں انٹرمیڈیٹ کی سطح کے برابر استعداد پیدا کرنے

کے خیال سے تیار کیا گیا ہے۔ اسی زمانے میں اورینٹل کالج میں پہلی بار ایک لسانی تجربہ گاہ Language Lab اور کمپیوٹر لیب (Coputer lab) بھی قائم کی گئی علاوہ ازیں شیرانی ہال کے فرش اور چھت کے درمیان ایک اور چھت ڈال کر اس کے زیریں حصے کو لائبریری اور بالائی حصے کو شیرانی ہال میں تبدیل کیا گیا۔

۲۰۰۱۔۲۰۰۰ء کی تعلیمی میقات سے اورینٹل کالج میں پہلی بار ایم۔فل اور پی ایچ۔ ڈی کی ریگولر کلاسوں کا اجرا ہوا۔ عربی، اُردو، فارسی اور پنجابی کے شعبوں ہں یہ پروگرام آغاز سے اب تک کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

۱۹۷۳ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی رو سے جن فیکلٹیوں کی تشکیل کی گئی تھی اورینٹل کالج ان میں کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ میں شامل تھا لیکن ۲۰۰۵ء میں یونیورسٹی میں بعض کلیات (Faculties) کی تشکیلِ نو کی گئی جس کے نتیجے میں مذکورہ کلیہ سے شعبہ اسلامیات کو الگ کر کے ایک نئی فیکلٹی کلیہ علومِ اسلامیہ کی بنا رکھی گئی اور اورینٹل کالج کے لسانی شعبوں کے لیے کلیہ علومِ شرقیہ کا نام تجویز ہوا۔ آج کل اس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر ہیں جنھوں نے ۱۴ر مارچ ۲۰۰۷ء کو یہ منصب سنبھالا اور اس حیثیت سے وہ مجلۂ تحقیق کے مدیر بھی ہیں۔

آج ۱۳۸ سال کے بعد اورینٹل کالج اپنی زندگی کی دوسری صدی کے نصف اول کا بھی بڑا حصہ گزار چکا ہے اور اکیسویں صدی کے لحہ لحہ بدلتے اور آگے بڑھتے منظر نامے میں اپنے مقام کی جستجو میں مصروف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ادارے نے گزشتہ ڈیڑھ صدی میں السنہ شرقیہ کی حفاظت کر کے علومِ مشرق کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیا۔ آج السنہ شرقیہ اور ان کے پاسبان اپنے جواز اور بقا کے سوال سے نبرد آزما ہیں اس معرکے میں سرخ روئی زبانوں کو زندگی کی بڑاتی کے ساتھ مربوط کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے ایک دانش ور وائس چانسلر ڈاکٹر اجمل نے اورینٹل کالج کے صد سالہ جلسہ میں ماضی کی بازیافت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ انھوں نے ایم۔اے فلسفہ کے بعد اورینٹل کالج کے ایم۔اے میں داخلہ لیا لیکن وہ یہ سفر جاری نہ رکھ سکے جس کا سبب ان کے بقول یہ تھا کہ ''جس قسم کے فلسفے کا علم میں نے حاصل کیا تھا اس میں الفاظ اور تصورات کا تجزیہ اس قدر شدید اور جارحانہ تھا کہ الفاظ اور معانی کے روابط بڑی مشکل سے قائم رہ سکتے تھے۔ ایم۔اے کی جماعتوں میں الفاظ کا وفور اور بیان کی روانی اتنی تند و تیز تھی کہ عقل اور تجزیہ اس سیلاب میں بہہ جاتے تھے ابہام کے اس بھنور کو میں ایک مہینے سے زیادہ برداشت نہ کر سکا اور چل دیا'' زبانیں اگر زندگی سے مربوط نہ ہوں تو الفاظ اپنے معانی کھو دیتے ہیں ابہام کا یہ بھنور شدید تر ہوتا جاتا ہے اور پھر علوم اور ان کی بنیاد بننے والی زبانوں کی بقا کا سوال سر اٹھانے لگتا ہے اور ینٹل کالج اپنی زندگی کی دوسری صدی میں لفظ و معنی کے اسی رشتے کی تلاش میں ہے۔اس رشتے کے استحکام سے السنۂ شرقیہ کے اس پاسبان کا مستقبل وابستہ ہے۔

(۱۹۹۵ء)

میر سوز کا سلسلۂ سخن

اردو شاعری کے عہدِ زرّیں میں غزل کی روایت کو آگے بڑھانے والے جن اساتذہ کا شمار ادبِ اردو کے مئورّخ نے طبقۂ دوم میں کیا ہے۔ میر سوز (متوفی ۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸) کا نام ان میں سرفہرست ہے۔

سید محمد میر سوز ۱۳۲۸ھ /۱۷۱۶ء میں دہلی میں پیدا ہوائے۔ وہ سید محمد زاہد دہلوی کے خلیفہ اور درویش مزاج انسان تھے۔ انھوں نے غزل میں ادائیہ طرز کو رواج دیا۔ ان کی یہ طرز اپنے عہد کا مقبول ترین اسلوب قرار پایا اور میر تقی میر ایسے اساتذہ بھی اس کی اثر پذیری سے آزاد نہ رہ سکے۔ سوز کا یہ رنگِ سخن فطری طور پر ان کے تلامذہ نے بھی اپنایا، لیکن اتفاق سے ہمارے ہاں زبان وشعر کے لیے سوز کی خدمات کو فراموش کر دیا گیا

ہے۔ سوز کے سوانح اور شخصیت پر ہم ایک الگ کتاب شائع کر چکے ہیں [۱] ذیل میں سوز
کے سلسلۂ سخن کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے اُردو غزل کی روایت کو آگے بڑھانے
کے لیے سوز کی خدمات اور اس سلسلے میں ان کی اثر پذیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حسرت موہانی نے ارباب سخن میں میر سوز کے چھ شاگردوں کی نشاندہی کی
ہے اور ان میں سے ایک یعنی نوازش (مرزا خانی نوازش) کے ذریعے ان کے سلسلۂ سخن کو
آگے بڑھایا ہے۔ [۲] حسرت کے بیان کردہ تلامذہ میں داغ، رند، ترقی، افسوس، نوازش
اور آشفتہ شامل ہیں لیکن ہماری دانست میں یہ فہرست نا تمام ہے۔ چنانچہ ہم نے مختلف
مآخذ سے سوز کے سترہ مزید شاگرد دریافت کیے ہیں جن سے سوز کے معلوم تلامذہ کی تعداد
تئیس (۲۳) ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سلسلۂ سخن کی ترویج حسرت کے مطابق صرف نوازش
سے ہو رہی ہے جب کہ ہم اس میں افسوس کو بھی شامل کرتے ہیں۔ نوازش کے تلامذہ میں
حسرت نے صرف دل گیر کے ہاں سلسلۂ تلمذ کو واضح کیا ہے جب کہ ہم سرور کے ہاں بھی
سلسلۂ تلمذ جاری پاتے ہیں۔ البتہ دو شاگرد ایسے ہیں جن کا تلمیذِ سوز ہونا اختلافی کہا جا سکتا
ہے۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ سطور میں پیش کریں گے۔ حسرت کے بعد تلامذہ سوز کی طرف
فائق رام پوری صاحب نے توجہ مبذول فرمائی [۳] لیکن ان کی فراہم کردہ فہرست میں بھی
کچھ کمیاں رہ گئی ہیں (کارِ دنیا کسی تمام نکرد) ہم نے حسرت اور فائق رام پوری دونوں کے
کاموں کو پیشِ نظر رکھ کر ان میں رہ جانے والی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں
میر سوز کے سلسلۂ تلمذ کو شعرائے اُردو کے قدیم تذکروں کی مدد سے روشن کیا گیا ہے۔ ہر
شاگرد کے ضمن میں متعلقہ تذکرے/تذکروں کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

پہلے ہم حسرت کے بیان کردہ تلامذۂ سوز کی تفصیل دیتے ہیں:

تلامذۂ میر سوز:

داغ، رند، ترقی، افسوس، نوازش، آشفتہ۔

تلامذۂ نوازش:

مخلص، دلگیر، غمگین، سرور۔

تلامذۂ دلگیر:

امانت۔

تلامذۂ امانت:

لطافت، فصاحت۔

تلامذۂ لطافت:

کلیم، شہرت۔

تلامذہ فصاحت:

امید، محبت، تسنیم۔

اب اس فہرست میں اضافے ملاحظہ ہوں:

تلامذہ میر سوز:

آصف الدولہ آصف

میر سوز کی زندگی کا اہم ترین دور آصف کی استادی کا زمانہ ہے۔آصف کے ہاں
سودا بھی ملازم رہے لیکن جس قدر تلمذ سوز سے ثابت ہے سودا سے ثابت نہیں۔ سعادت
خاں ناصر نے لکھا ہے کہ ابتدا میں میر محمد علی وہم سے افادت اندوز ہوئے تھے۔ [42]

مرزا احمد علی خاں سوزاں:

ناصر نے لکھا ہے ''بلبلِ خوش آہنگ مرزا احمد علی خاں شوکت جنگ تخلص سوزاں خلف مرزا نواب احمد علی خاں، تربیت یافتہ میر سوز کا تھا۔5 فائق رامپوری نے سوزاں کا نام شیخ شمس الدین بتایا ہے 6 یہ التباس اس لیے پیدا ہوا کہ سوزاں تخلص کے دو شاعر سوز کے شاگرد ہوئے ہیں۔ فائق رامپوری صرف شیخ شمس الدین سوزاں سے واقف ہیں۔

قاسم نے احمد علی سوزاں کو خوش تقریر، فصاحت بیان، صاحبِ امتیاز، یار باش، خوش اختلاط، نیک معاش، رنگین گفتار اور مالکِ اشعارِ آبدار قرار دیا ہے۔ وہ مرزا علی خاں کے صاجبزادے تھے۔ 7

شیخ شمس الدین سوزاں:

دہلوی الاصل اور فرخ آبادی المسکن تھے۔ سپاہ گری مشغلہ تھا۔ قاسم کا بیان ہے کہ ان کا مذاقِ سخن ان کے اپنے مزاج کی خبر دیتا ہے۔ 8

موتی لال حیف:

عبدالغفور خاں نساخ کا بیان ہے کہ:

''حیف تخلص، موتی لال ولد لالہ بت سنگھ، شاگردِ میر سوز۔ گیارہ سو چھیانوے ہجری میں لکھنو میں تھے'' 9

جان عالم جان:

علومِ عربیہ سے بہرہ اندوز تھے۔ نواب سوز خاں مغفور برادرِ کوچک نواب روشن الدولہ ظفر خان کے صاحب زادے تھے۔ 10 حسن اور بخشی کی داستان (از جرأت) میں جان عالم خاں کی فرمائش سے متن طوائف کے یہاں خواجہ حسن کا جانا اور طوائف کا دعوت دینا نظم کیا ہے۔ جان عالم رقص و سرود کے عاشق تھے۔ 11

مرزا حسین رضا عیش:

ناصر نے لکھا ہے:

"کاظمِ غیظ وطیش مرزا حسین رضا، تخلص عیش شاگردِ میر سوز"۔ ۱۲

مصحفی نے انھیں جوانِ خندہ رو، خوش خلق اور متواضع کہا ہے۔ ۱۳ نساخ نے بھی شاگردِ سوز قرار دیا ہے۔ ۱۴

مرزا محمد عسکری عیش:

قدرت اللہ قاسم ۱۵ اور نساخ ۱۶ کی رائے میں وہ شاگردِ قدرت اللہ ہیں لیکن ان کا اپنا شعر سوز سے استفادے کا مظہر ہے

یہ غزل عیش ہے تصدّقِ سوز مجھ سے ہوتی تھی انصرام کہیں ۱۷

نساخ کے مطابق دہلی کے باشندے تھے مرشد آباد میں مقیم تھے اور جس صاحب تذکرہ نے ان کا تخلص عسکری لکھا ہے غلطی کی ہے۔ ۱۸

لالہ رائے فریاد:

بقول نساخ لکھنوی تھے۔ ولدیت لالہ سندر رائے کائستھ ۱۹

صاحب گلزار ابراہیم نے بھی ان کا شاگرد سوز ہونا تسلیم کیا ہے۔

میر شمس الدین ہوش:

قاسم اور شیفتہ ۲۰ کے ہاں تلمذ کا بیان واضح ہے، قاسم نے لکھا ہے "مردی ست نیک خو"۔ از بلدۂ لکھنو، فصاحت افروز۔ از تلامذۂ محمد میر سوز۔ ۲۱

میر نبی جان مدہوش:

شیفتہ نے لکھا ہے "نامش معلوم نہ شد۔ از شاگردانِ میر سوز بود" اس کے بعد

شیفتہ نے ذیل کا شعر نقل کیا ہے، از وست:

مرا جس ناز سے تو نے لیا دل
خدا جانے ہے اس کو یا مرا دل [22]

یہ شعر قدرت اللہ قاسم نے میر شمس الدین ہوش سے منسوب کیا ہے۔[23] جب کہ شیفتہ اور نساخ کے ہاں بھی یہ شعر مدہوش سے منسوب ہے البتہ نساخ کے ہاں اس کا پہلا مصرع یوں ہے: ع

صنم جس ناز سے تو نے لیا دل

نساخ نے لکھا ہے:

نبی خان نبیرۂ خواجہ محمد باسط شاگرد میر سوز۔ [24]

سید امجد علی خان عجز:

ان کا سراغ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطات میں محفوظ ایک بیاض سے ملتا ہے۔ اس میں نعتیہ کلام درج ہے اور زمانہ کتابت ۱۳۲۶ھ اور ۱۳۴۸ھ کے درمیان ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے خیال میں ''نواب سید امجد علی خاں عجز غالباً لکھنو کے ایک غیر معروف شاعر ہیں جو سوز کے شاگرد تھے اس بیاض میں ان کی متعدد غزلیں بلا ترتیب ردیف درج ہیں۔ [25]

میر محمد یعقوب عیاش:

لکھنو کے رہنے والے تھے۔ سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ پہلے میر تقی میر کے شاگرد تھے پھر میر سوز کے ہوئے۔ سوز کے بعد قمر الدین منت سے تلمذ رہا اور بعدہ مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ والد کا نام میر محمد انور تھا۔ [26]

سید قدرت علی طپاں:

دو اشعار کے نمونے کے ساتھ ان کا خلف و شاگرد سوز ہونا ناسخ نے ذکر کیا ہے، ۲۷؎ ان کا ذکر ہم نے میر سوز کے سوانح پر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ ۲۸؎

گنّا بیگم:

قدرت اللہ قاسم نے مجموعہ نغز میں لکھا ہے:

''بعضی گویند کہ تخلص وی منتظر است۔ امّا از آنکہ بسر حدِ تحقیق نہ پیوستہ بود۔۔۔وی دخترِ مرد بہشتی علی قلی خاں شش انگشتی و محل ذات الاختصاص نواب غفراں مآب وزیر الممالک عماد الملک غازی الدین خان بہادر و زنی جمیلہ، شوخ مزاج شکیلہ ظرافت امتزاج، تیز ذہن، ذکی الطّبع، خوش فکر، لطیف الوضع، حاضر جواب، بدیہہ گو، حسن الخطاب، کشادہ رو، بسیار صاحب جمال، در امورِ زیبائی خیلی دانا و صاحب کمال بود۔ طبع شعر آشنا، مزاج نکتہ پیرا، فکر درست، تلاشِ رنگین و چست داشت۔ عروسانِ بکر فکر خود گاہی از نظر سخن سنج فصاحت افروز محمد میر سوز میگزرانید و گاہی مرزا محمد رفیع سودا''۔ الخ ۲۹؎

ان کا ذکر حکیم فصیح الدین رنج نے بہارستان ناز میں بھی کیا ہے۔ لیکن شاگرد سوز ہونا وہاں مذکور نہیں ہے۔ بہارستان ناز کی عبارت درج ذیل ہے:

''گُنّا تخلص، گُنّا بیگم نام، صبیۂ علی قلی خان والہ تخلص عالی مقام، زوجہ نواب عماد الملک۔ نقل ہے کہ جس روز اس کا بیٹا فوت ہوا اور نواب نے خبر منگوائی اس نے یہ شعر لکھ بھیجا:

از حالِ ما مپرس کہ دل چاک کردہ ام

لختِ جگر بریدہ تہِ خاک کردہ ام ۳۰؎

میر فتح علی شیدا:

ساکن شمس آباد تھے۔ سوز نے متبنّٰی کر لیا تھا اسپرنگر نے لکھنو میں افسر ہونا اور آصف الدولہ سے پانسو روپے ماہوار پانا بھی ذکر کیا ہے ۳۱ قاسم کے مطابق ان کے دیوان میں قریباً تین ہزار شعر ہیں ۳۲ قاسم یا اسپرنگر کسی نے ان کا شاگرد ہونا ذکر نہیں کیا لیکن ہمیں فائق رام پوری کے اس خیال سے اتفاق ہے:

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سوز کا متبنّٰی ہو وہ سوز کا شاگرد کیوں نہیں ہوسکتا۔ سودا کا شاگرد ضرور سہی لیکن ابتدا میں ضرور سوز سے مشورہ کیا ہوگا اور بعدہٗ سودا سے رجوع کیا ہوگا" ۳۳

محمد انور الدین قانع:

وطن مئو، محمد آباد اور مولد شاہ جہان آباد تھا۔ والد منصب دار شاہی تھے۔ قانع، حافظِ قرآن، خلیق اور قابل تھے، ان کا شاگردِ سوز ہونا قدرت اللہ شوق نے بیان کیا ہے ۳۴

انشاء اللہ خان انشا:

تذکرہ شعرائے اردو میں میر حسن کے ترجمہ انشاء سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انشا، سوز کے شاگرد تھے۔

میر حسن نے لکھا ہے:

"نو مشق است اکثر طرزِ او بہ طرزِ میر سوز می ماند" ۳۵

حکیم قدرت اللہ قاسم کے مطابق:

"طرزِ گفتارش بہ شاعرِ فصاحت افروز محمد میر سوز ماناست" ۳۶

یہ اور اس قسم کے بعض بیانات سے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ انشا بھی سوز کے شاگرد تھے۔ انشا کے ایک سوانح نگار شیام لال کاکڑا عابد پیشاوری اس خیال کی تردید کرتے ہوئے

کہتے ہیں:

''کسی کے طرز کا تتبع اس کی شاگردی کے بغیر بھی ممکن ہے'' ۳۷؎

اس لیے ان کے خیال میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

''انشا کا انداز بھی ابتدا میں میر سوز کے رنگِ کلام سے مشابہ تھا'' ۳۸؎

شیام لال عابد پیشاوری کی اس بات کو اصولی طور پر ہم بھی درست تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن احد علی خان یکتا کا بیان اس سلسلے میں بہت واضح ہے کہ:

''سوز کے بہت سے شاگرد ہوئے ہیں اور اس کے انداز پر نہیں پہنچے لیکن چند شخص جو سلیقۂ کامل اور فہمِ رسا رکھتے تھے مثل حکیم انشاء اللہ خان انشا اور حکیم رضا قلی آشفتہ اور نوازش حسین خاں نوازش'' ۳۹؎

تلامذہ نوازش:

حسرت نے شاگرد نواش کے طور پر جو اطلاع دی ہے اس میں ذیل کے نام موجود نہیں ہیں:

مرزا کریم بیگ راغب ۴۰؎

شیخ اظہر علی اظہر ۴۱؎

مولوی عسکری عسکر ۴۲؎

کلب حسین خاں الطاف ۴۳؎

مرزا ابراہیم بیگ شرر ۴۴؎

مرزا مخدوم بخش ذکا ۴۵؎

شیخ محمد سلیمان شعلہ ۴۶؎

تلامذۂ افسوس:

حسرت موہانی نے سوز کا سلسلۂ سخن صرف نوازش سے جاری رہنا ظاہر کیا ہے۔

ذیل میں سوز کے ایک اور شاگرد شیر علی افسوس کے تلامذہ کے نام دیے جاتے ہیں:

سید چراغ علی حیف [47]

میر حسین علی تاسف [48]

تلمیذ سرور:

مرزا احمد علی سہا (شاگردِ نوازش) [49]

دبستانِ سوز کی غزل

میر سوز کی اثر پذیری سے یوں تو ان کے معاصر اساتذہ بھی آزاد نہیں لیکن ہم ذیل میں ان کے سلسلۂ سخن سے براہ راست وابستہ شعرا کے کلام پر ایک نظر ڈالتے ہیں تاکہ دیکھا جا سکے کہ سوز کے تربیت یافتہ شعرا نے ان کے رنگِ سخن کو کس قدر نبھایا اور اردو کی غزل میں کن رجحانات کے حامل ہوئے۔

تلامذۂ سوز کے ہاں بالعموم محبوب کی بے التفاتی، ہجر کی کیفیات، زندگی سے بے زاری، غم، شکایت زمانہ اور مجازی محبت کے دیگر مضامین پائے جاتے ہیں۔ ان موضوعات سے آگے بڑھنے والے تلامذہ کے ہاں ایک ردّ عملی لہجے نے جنم لیا ہے، جو انھیں امتیاز عطا کرتا ہے یہ ردِّ عملی لہجہ صرف جذبہ انتقام سے مملو نہیں بلکہ آگے بڑھتا ہے اور اس میں زندگی کے حقائق کا عرفان آمیز ہو جاتا ہے۔

ان مضامین کی اہمیت ایک طرف، دوسری جانب دبستانِ سوز کے شعرا کا وصفِ خاص بول چال کا لہجہ اور میر سوز کے ادائیہ طرز کی پیروی ہے۔ اس اسلوب میں بطورِ خاص،

آصف الدولہ، نوازش، آشفتہ، سوزاں اور جان عالم کے نام لیے جا سکتے ہیں۔
دبستان سوز کے ان رویوں کا جائزہ لینے کے لیے اب ہم تلامذۂ سوز کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں:

بول چال کا لہجہ

میں نے پوچھا اس سے کچھ تجھ میں وفا ہے
تو مڑ کر ، دیکھ کر ، ہنس کر کہا، 'ہے'

(آصف)

اس سنگدل کے دل میں زرا بھی نہ راہ کی
دور از اثر سدا رہی ہت تیری آہ کی

(جان عالم)

اس کے کوچہ میں نہیں ہم کو کسی کا خطرہ
پر خفا وہ نہ ہو آتا ہے اسی کا خطرہ

(سوزاں)

بیانِ مجاز

باتیں تری سنا کریں اور دیکھیں تیری شکل
وہ مدعائے گوش ہے یہ مدعائے چشم

(دلگیر، شاگرد نوازش)

مرا جس ناز سے تو نے لیا دل
خدا جانے ہے اس کو یا مرا دل

(مدہوش)

کس طرح غیر سے ہم تم کو بہم دیکھیں گے
یہ تو ان آنکھوں سے واللہ نہ ہم دیکھیں گے

(آصف)

ہنس کر مجھے لوگوں میں اشارات نہ کیجیے
رسوائی ہو جس بات سے وہ بات نہ کیجیے

(افسوس)

اے پری نامِ خدا تیری سجاوٹ کیسی
قہر چھپ تس پہ یہ انگیے کی کساوٹ کیسی

(آصف)

دست و لب نزع میں جو ہلتے رہے
شوقِ بوس و کنار تھا دل میں

(آشفتہ)

محبوب کی بے التفاتی

یہ نہ آنے کے بہانے ہیں سبھی ورنہ میاں
اتنا تو گھر سے مرے کچھ نہیں گھر دور ترا

(آصف)

تو نے افسوس کیا کیا دشمنِ جاں کو دل دیا
یہ تیری عقل جل بجھے آگ لگے شعور کو

(افسوس)

یہی حسرت ہمیں اے جان رہی مرگ تلک
ایک دن تم نے نہ کی ہنس کے کبھی پیار کی بات

(آصف)

میں تو ہوں سمجھتا انھیں وہ مجھ کو نہ سمجھیں
رکھتا ہے عجب تہ یہ سمجھنا نہ سمجھنا

(نوازش)

بوسہ کے واسطے چمٹا تو لگا کہنے مجھے
بس کہیں دور بھی ہو منہ کو ترے آگ لگے

(آشفتہ)

یار ہنستا ہے چشمِ تر کو دیکھ
گریہ ٹک اپنے تو اثر کو دیکھ
تیرے خط کا جواب آیا ہے
ہوش کھول آنکھ نامہ بر کو دیکھ

(ہوش)

ہجر کی کیفیات

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو
میں ہوں اور رات ہے اور بسترِ تنہائی ہے

(آصف)

پھر ہجر ہے وہی ، وہی دن ہے پہاڑ سا
وصلِ صنم تو رات کو اک خواب ہوگیا

(افسوس)

وہ اگر آئے پشتِ بام کہیں
میں بھی کر لوں اسے سلام کہیں

(عیشؔ)

شبِ ہجراں کی سحر ہی نہیں ہوتی کیا آہ
آج اذاں بھی تو نہیں مرغِ سحر دیتا ہے

(نوازش)

دل تو کہتا ہے یار آتا ہے
پر مجھے کب قرار آتا ہے

(آصف)

بے زاری

ہمیشہ آگ نکلتی ہے میرے سینے سے
الٰہی موت دے گزرا میں ایسے جینے سے

(آشفتہ)

گلشنِ دہر میں کیونکر وہ بھلا شاد پھرے
رات دن جس کے لیے گھات میں صیاد پھرے

(حیف)

اس کے بدلے مجھے برسوں ہی رلاتا ہے فلک
اک گھڑی چین یہ کم بخت اگر دیتا ہے

(نوازش)

اترا نہ آ کے یاں کوئی جز کاروانِ غم
ماتم سرا سے کم نہیں یارو سرائے دل

(ترقی)

ردعملی لہجہ

سنتے ہی ترا یار ملا اور کسی سے
دل تو بھی چل اب دل کو لگا اور کسی سے

(شعلہ)

نہ ہم نازک مزاجوں سے اٹھیں گے ناز دلبر کے
یہ غمزہ جو اٹھاتا تھا وہ اب دل ہی نہیں بر میں

(سرور)

کام اپنا خیالِ رخِ جاناں سے نکالا
کارِ شبِ عشرت، شبِ ہجراں سے نکالا

(دلگیر)

بصیرت

سمجھ کر ہنسی مت لگاؤ کہیں دل
نہیں دل لگی دل لگانا جدا ہے

(نوازش)

دیوانہ اب کے دیکھیے ہوتا ہے کون کون
آتے ہیں زور شور سے پھر دن بہار کے

(ترقی)

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے
یارانِ رفتگاں کو روتے ہو کیا ترقی
کیا ہم روانہ سوئے ملکِ عدم نہ ہوں گے

(ترقی)

مسافر ہیں ہمارے پاس بیٹھو
کوئی دم میں کہاں ہم اور کہاں تم

(نوازش)

تشبیہ و استعارہ

بنا گوشِ بلوریں پر یہ دُر لگتا پیارا ہے
کہ جیسے متصل مہتاب کے ہوتا ستارا ہے

(حیف)

بیٹھا ہے یار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے
جوں تابداں میں شیشہء رنگیں دھرے ہوئے

(جان)

تمثال کاری

شکلِ مجنوں کل جو دیکھی ہم نے تصویروں کے بیچ
ایک مشتِ استخواں تھی لاکھ زنجیروں کے بیچ
وہ خماری انکھڑیاں، بکھرے ہوئے بالوں میں یوں
جس طرح دو مست جکڑے ہوویں زنجیروں کے بیچ

(ترقی)
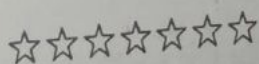
☆☆☆☆☆☆☆

میر سوز کا سلسلۂ سخن
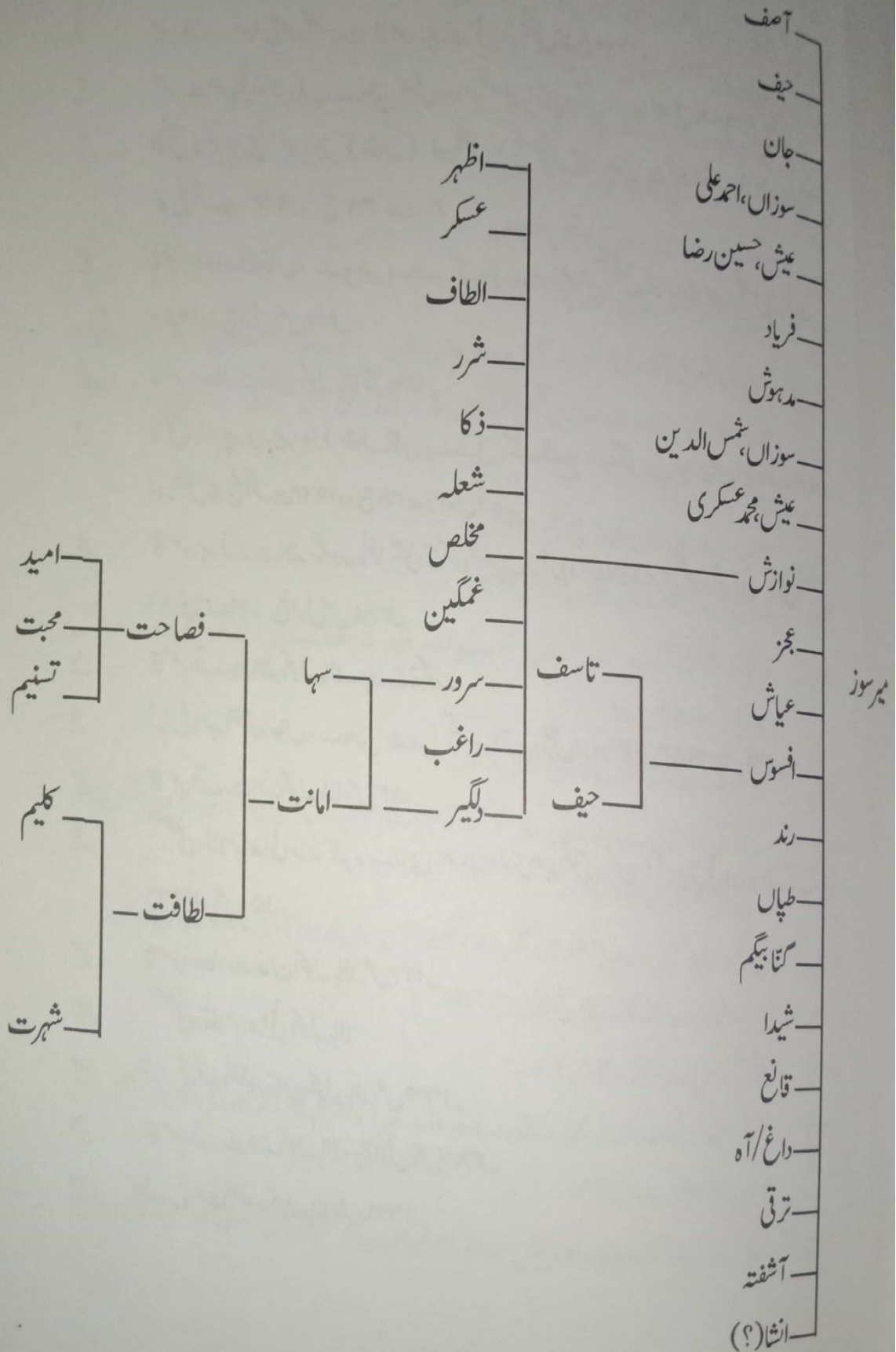
- میر سوز
  - آصف
  - حیف
  - جان
  - سوزاں، احمد علی
  - عیش، حسین رضا
  - فریاد
  - مدہوش
  - سوزاں، شمس الدین
  - عیش، محمد عسکری
  - نوازش
    - اظہر
    - عسکر
    - الطاف
    - شرر
    - ذکا
    - شعلہ
    - مخلص
    - غمگین
    - سرور
      - سہا
        - فصاحت
          - امید
          - محبت
          - تسنیم
        - لطافت
          - کلیم
          - شہرت
      - امانت
    - راغب
    - دلگیر
  - عجز
  - عیاش
  - افسوس
    - تاسف
    - حیف
  - رند
  - طپاں
  - گنا بیگم
  - شیدا
  - قانع
  - داغ/آہ
  - ترقی
  - آشفتہ
  - انشا(؟)

حوالے اور حواشی

میر سوز......سوانح اور شخصیت لاہور: یونیورسٹی اورینٹل کالج ۲۰۰۰ء

۱۔ حسرت موہانی، ارباب سخن اول و دوم، لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲، ص ۴۔

۲۔ فائق رام پوری میر سوز (مقالہ) اورینٹل کالج میگزین مدیر سید عبداللہ لاہور: اورینٹل کالج اگست ۱۹۶۲ء ج ۳۸ عدد ۴

۳۔

۴۔ ناصر، سعادت خاں، خوش معرکہ زیبا: مرتبہ مشفق خواجہ، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۰ء، ج اول، ص ۲۱۶۔

۵۔ ناصر، سعادت خان، محولہ بالا، ص ۲۲۰۔

۶۔ فائق رام پوری، میر سوز (مقالہ) اورینٹل کالج میگزین، مدیر سید عبداللہ۔ لاہور، اورینٹل کالج اگست ۱۹۶۲ء، ج ۳۸ عدد ۴، س ۷۲۔

۷۔ قاسم، میر قدرت اللہ، مجموعہء نغز یعنی تذکرہ شعرائے اُردو در دو جلد مرتبہ محمود شیرانی دہلی: نیشنل اکادمی ۱۹۷۳ء ج اول ص ۳۲۷۔

۸۔ قاسم، قدرت اللہ، محولہ بالا۔ جائے مذکور۔

۹۔ نساخ، عبدالغفور خاں، سخن شعرا لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۲ء، س ۱۴۵۔

۱۰۔ قاسم، قدرت اللہ، محولہ بالا، ص ۱۵۳۔

۱۱۔ مصحفی، غلام ہمدانی، تذکرہ ہندی: مرتبہ مولوی عبدالحق، دکن: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۱۵۱۔

۱۲۔ ناصر، سعادت خان، محولہ بالا، ص ۲۲۲۔

۱۳۔ مصحفی، غلام ہمدانی، محولہ بالا

۱۴۔ نساخ، عبدالغفور خاں، محولہ بالا، ص ۳۳۹۔

۱۵۔ قاسم، قدرت اللہ، محولہ بالا، ج اول، ص ۳۸۴۔

۱۶۔ نساخ، عبدالغفور، محولہ بالا، ص ۳۳۸۔

لطف، مرزا علی تذکرہ گلشن ہند لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء ص ۱۲۸

۱۷۔ نساخ، جائے مذکور

۱۸۔ نساخ، عبدالغفور خان، محولہ بالا، ص ۳۶۷۔

۱۹۔ شیفتہ، محمد مصطفیٰ خان، محولہ بالا، ص ۶۴۶۔

۲۰۔ قاسم، قدرت اللہ، محولہ بالا، ص ۳۵۳۔

۲۱۔ شیفتہ، محمد مصطفیٰ خان، محولہ بالا، ص ۴۸۱۔

۲۲۔ قاسم، قدرت اللہ، محولہ بالا، ص ۳۵۳۔

۲۳۔ نساخ، عبدالغفور خاں، محولہ بالا، ص ۴۲۶۔

۲۴۔ زور، محی الدین قادری، تذکرہ مخطوطات، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کی پانچ سو

۲۵۔ عربی فارسی، اردو اور ہندی قلمی کتابوں کا تذکرہ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورہ، ۱۹۸۴ء،

ج سوم، ص ۳۸۔

۲۶۔ ناصر، سعادت خان، محولہ بالا، ص ۴۲۴۔

۲۷۔ نساخ، عبدالغفور خان، محولہ بالا، ص ۳۰۲۔

۲۸۔ دیکھئے راقم کی کتاب میر سوز - سوانح اور شخصیت لاہور: یونیورسٹی اورینٹل

کالج، ۲۰۰۰ء ص ۸۱

۲۹۔ قاسم، قدرت اللہ، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۴۵۔

۳۰۔ رنج، فصیح الدین، بہارستان ناز تذکرہ شاعرات: مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور: مجلس ترقی

ادب ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۰-۱۹۱۔

۳۱۔ اسپرنگر، یادگار شعرا مترجمہ طفیل احمد، لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی ۲۹۸۵ء، ص ۱۰۴۔

۳۲۔ قاسم، قدرت اللہ، محولہ بالا ج اول، س ۳۵۶۔

۳۳۔ فائق رام پوری، محولہ بالا، س ۷۸۔

۳۴۔ شوق: قدرت اللہ، تذکرہ طبقات الشعراء، مرتبہ نثار احمد فاروقی، لاہور: مجلس ترقی

ادب ۱۹۶۸ء، س ۴۱۴۔

۳۵۔ میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ حبیب الرحمٰن شروانی، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند

۱۹۴۰ء ،ص۱۹۔

۳۶ قاسم،قدرت اللہ،محولہ بالا،ص۸۰۔

۳۷ عابد پیشاوری،شیام لال کاکڑا،انشاء اللہ خان انشا ،لکھنو؛اتر پردیش،اردو اکادمی ۱۹۸۵ء ،ص۱۰۹۔

۳۸ عابد پیشاوری،محولہ بالا،جائے مذکور۔

۳۹ یکتا،احد علی خاں، دستور الفصاحت ،مرتبہ:امتیاز علی خاں عرشی رام پور۱۹۴۳ء ، ص۵۲۔

۴۰ ناصر،سعادت خاں،محولہ بالا، ص۲۲۸۔

۴۱ ایضاً ص ۲۳۵۔

۴۲ ایضاً ص ۲۳۶۔

۴۳ ایضاً ص ۲۳۷۔

۴۴ ایضاً

۴۵ ایضاً

۴۶ ایضاً ص۲۲۸۔

۴۷ ایضاً ص۲۴۳۔

۴۸ ایضاً ص۲۴۴۔

۴۹ ایضاً ص۲۳۴۔

مولانا ظفر علی خان کا سرمایۂ گفتار

یہ مضمون تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں موضوع کا تعارف پیش کیا گیا ہے، دوسرے حصے میں مولانا ظفر علی خان کی خطیبانہ معرکہ آرائیوں کے کچھ اقتباسات ہیں اور تیسرے حصے میں مختلف مآخذ کی مدد سے مولانا مرحوم کے سرمایۂ گفتار کی نشان دہی کی گئی ہے۔

﴿1﴾

لفظ کے آئینے میں کردار کا جوہر نہ ہو تو سخن بے رنگ ہو جاتا ہے۔ سخن کی رنگینی صناعت یا بیان و بدیع کے حربوں سے نہیں پھوٹتی بلکہ اس کی تاثیر کی جڑیں سخنور کے باطن میں پنہاں ہوتی ہیں۔ ورنہ ہم جانتے ہیں کہ زبان و بیان کے اعتبار سے ہنرمندی کے دور، معنی آفرینی اور سخن کی ثمروری کے دور نہیں ہیں۔

وہ الفاظ جن کے پسِ پردہ سخن ور کے باطن کا چراغ روشن نہ ہو سینۂ قرطاس کی سفیدی کو تو سیاہ کر سکتے ہیں، مخاطب کے باطن کو نہیں اجال سکتے۔ نالۂ نَے سے ٹپکنے والا سرودِ مَے، نَے نواز کے دل سے جنم لیتا ہے، سخن میں سوز در آئے تو پھر ع

یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

یوں تو یہ ایک عام اصول ہے لیکن خطیب اور مخاطب پر اس کا اطلاق سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ خطیب اپنے تجربے کو کام میں لا کر عوام کی پیشانیوں سے مضامین چن سکتا ہے لیکن مخاطب اس کی پکار پر اسی صورت میں لبیک کہتے ہیں جب ان کے دل یہ گواہی دے رہے ہوں کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے کہنے والے کا عمل اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ایک اونس عمل، ایک ٹن وعظ پر بھاری ہوتا ہے۔ اگر سخن کے پیچھے کردار کا چراغ روشن نہ ہو تو پھر خطابت بہ قول فرائیڈ علمی بدکاری ہے اور بہ قول لارڈ بائرن ''جو لوگ محض لسّان یا الفاظ ہوتے ہیں وہ گمراہی کو خوش نما پیش کرتے ہیں۔'' [1] ہماری ماضی قریب کی تاریخ مختلف شعبہ ہائے حیات میں غیر معمولی شخصیتوں سے معمور ہے ادب، مذہب، صحافت، سیاست خطابت تمام شعبے ایسی نابغۂ روزگار مثالوں سے پُر ہیں جن کے مثیل مدتوں پیدا نہیں ہوتے۔

مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء......۱۹۵۶ء) بھی ایک ایسے ہی نابغۂ روزگار فرد تھے جنھوں نے ادب، صحافت، سیاست کے ساتھ خطابت کے میدان میں بھی معرکے سر کیے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مشن سکول وزیر آباد سے حاصل کیا۔ ۱۸۸۵ء میں مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد پٹیالہ بھیج دیے گئے، جہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور علی گڑھ چلے آئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ان کی مادرِ علمی قرار پائی اور حسرت موہانی، محمد علی

جوہر، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور مولوی امین زبیری جیسے لوگ ہم مکتب۔ ظفر علی خاں نے ۱۸۹۲ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اور الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۸۹۵ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی، بی۔اے کے فوراً بعد نواب محسن الملک نے ظفر علی خاں کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ ۱۸۹۶ء میں وہ حیدر آباد چلے آئے جہاں انھوں نے مختصر عرصہ میں ترقی کر کے مختلف اہم مناصب حاصل کیے۔ ابتدا میں فوج کی ملازمت کی پھر مترجم ہوم آفس، رجسٹرار لیجسلیٹو کونسل، اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری اور اتالیق ولی عہد سلطنت میر عثمان علی خان کے مناصب پر فائز ہوئے۔ حیدر آباد کے زمانہ قیام ہی میں انھوں نے ۱۹۰۲ء میں ماہنامہ افسانہ اور ۱۹۰۳ء میں دکن ریویو جاری کیے بعد ازاں افسانہ کو بھی دکن ریویو میں ہی مدغم کر دیا گیا۔ ظفر علی خاں نے حیدر آباد میں جو اہمیت حاصل کر لی تھی اس پر ان کے حاسدین کا ایک گروہ پیدا ہوا جن کی مذموم مساعی سے انھیں اکتوبر ۱۹۰۹ء میں، سازش کے الزام میں حیدر آباد سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ ظفر علی خاں کرم آباد چلے آئے۔ یہاں ان کے والد مولوی سراج الدین احمد زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ ۶ دسمبر ۱۹۰۹ء کو مولوی سراج الدین احمد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم والد کی خواہش تھی کہ ظفر علی خاں زمینداروں کی اصلاحِ احوال کے لیے جاری کیے گئے، ان کے اخبار، زمیندار کی ادارت سنبھال لیں۔ چنانچہ والد کی وفات کے بعد ظفر علی خاں نے یکم جنوری ۱۹۱۰ء کو زمیندار کی ادارت سنبھال لی۔ جسے بعد ازاں وہ کرم آباد سے لاہور لے آئے۔ زمیندار کی ادارت کے ساتھ ساتھ ظفر علی خاں نے اگست ۱۹۱۰ء میں پنجاب ریویو اور دسمبر ۱۹۱۴ء میں لمعات بھی جاری کیے۔ یہ دونوں رسالے تو کچھ زیادہ زندگی نہ پا سکے، لیکن زمیندار کا چراغ جلتا رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ اس کی لَو بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں زمیندار ہندوستان کا سب سے بڑا اُردو اخبار بن گیا اور اس سے وابستہ افراد ہندوستان کے معتبر ترین صحافی۔ ۱۹۱۳ء میں جب انڈین پریس ایکٹ نافذ ہوا تو زمیندار کے گلے پر بھی اس کی چھری پھری۔ ظفر علی خاں نے اس کے خلاف احتجاج کے لیے بیرونِ ملک کی راہ لی اور انگلستان جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے پریس ایکٹ کی خرابیوں کے خلاف مہم چلائی۔ پارلیمنٹ کے ارکان سے ملاقاتیں کیں، تقاریر کیں، مضامین لکھے۔ یہ مضامین The Indian Press Act نامی ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر کے پارلیمنٹ کے ارکان میں تقسیم بھی کیے گئے۔ انگلستان سے واپسی پر وہ ترکی چلے گئے اور خلیفۃ المسلمین سے ملاقات کی، انھیں اہلِ ہند کی طرف سے ہلالِ احمر ترکی کے لیے فنڈ پیش کیا۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں وطن لوٹے تو دہلی اور لاہور میں شان دار استقبال ہوا لیکن ساتھ ہی انھیں گرفتار کر لیا گیا اور کرم آباد ان کے لیے جائے نظر بندی قرار پایا۔ اس نظر بندی کے دوران انھوں نے حکومت سے مراسلت کی جس کے نتیجے میں بعض یقین دہانیوں کے ساتھ انھیں ایک علمی و ادبی پرچہ ستارۂ صبح جاری کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس دوران میں انھوں نے ایک کمرشل ادارہ قائم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ تاہم ستارۂ صبح جاری ہوا اور جلد ہی ہفتہ وار سے روزانہ کر دیا گیا۔

ظفر علی خاں اس اسارت سے رہا ہوئے تو حضرو (اٹک) میں کی گئی ایک تقریر کی بنا پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر کے ۱۵ دسمبر ۱۹۲۰ء کو لاہور سے پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اب کی بار بغاوت کا طویل مقدمہ چلا ۵ نومبر ۱۹۲۴ء کو چار سالہ اسارت کے بعد رہا ہوئے تو بھی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۲۹ء میں مقدمہ سازش اور ۱۹۳۰ء میں تحریک نمک سازی

کے سلسلہ میں بھی ان منازل سے گزرنا پڑا۔ حادثۂ کانپور، فسادات ملتان، غازی علم الدین شہید کے مقدّمے، اور ہندوستان میں رونما ہونے والے ہر اہم واقعے میں ظفر علی خاں کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آتا رہا۔ جب حجاز میں شریف حسین اور ابن سعود کی آویزش کی اطلاعات ہندوستان آنا شروع ہوئیں اور ہندوستان میں اس مسئلہ پر اضطراب پیدا ہوا تو خلافت کمیٹی نے تحقیقِ احوال کے لیے جو وفد روانہ کیا اس میں مولانا ظفر علی خاں بھی شامل تھے۔

۱۹۲۷ء میں انھوں نے اسلامی بازار کی تحریک شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں کو معاشی میدان میں ہندوؤں کے مقابل لانا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مصر کا سفر کیا اور ۱۹۳۳ء میں کانگرس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس سے پہلے ۱۹۳۰ء میں مجلس احرارِ اسلام کے پلیٹ فارم کو رونق بخشی، لیکن ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے مسئلہ پر مجلسِ احرار سے اختلاف کے باعث انھوں نے اس جماعت سے ترکِ تعلق کر لیا اور ایک نئی تنظیم مجلس اتحاد ملت قائم کی۔ اب ہندوستان میں حالات و واقعات کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں جب سیاسی بساط کا پانسا پلٹ گیا تو ظفر علی خاں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انھوں نے قائداعظم کو پنجاب بلایا اور یہاں مسلم لیگ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اب ظفر علی خاں مسلم لیگ کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں جب لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں قرارداد پاکستان پیش ہوئی تو ظفر علی خاں اس موقع پر بھی موجود تھے۔ انھوں نے قائداعظم کی خواہش پر اس قرارداد کا فی البدیہہ اردو ترجمہ پیش کیا۔ ظفر علی خاں، اس کے بعد مسلم لیگ کے قافلے کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے۔ تا آنکہ قوم نے ایک صدی کی جدوجہد کے بعد ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی منزل پالی، اس طویل مسافت کے بعد اب وہ تھک چکے تھے۔ علالت اور چند در چند عوارض نے انھیں آن لیا اور قیام پاکستان کے بعد

ترجموں کے بورڈ کے اجلاس (لاہور ۵ مئی ۱۹۴۸ء) اردو کانفرنس پنجاب یونیورسٹی (لاہور ۱۹۵۳ء) ایک عوامی جلسے (۱۹۵۳ء لاہور) اور تراسی ویں سالگرہ کے اجلاس (کرم آباد ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء) میں شرکت کے علاوہ کسی خاص سرگرمی میں حصہ نہ لے سکے اور اپنے عہد میں ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آزادی کی جوت جگانے والا یہ فعّال راہ نما ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو خاموشی کے ساتھ جہان سے گزر گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

﴿2﴾

مولانا ظفر علی خان کی دلچسپیوں کے دوائر متنوع رہے۔ وہ بیک وقت کامیاب مترجم، انشا پرداز، جریدہ نگار اور شاعر ہونے کے ساتھ ایک قابل توجہ خطیب بھی تھے۔ دراصل ان لوگوں کے نزدیک یہ تمام صفات حصولِ مقصد کا ذریعہ تھیں۔ وہ متعیّن راہوں اور متعیّن منزلوں کے راہی تھے چنانچہ ان کی خطابت بھی ان کی دیگر صلاحیتوں کی طرح قومی بیداری کے مقصدِ عزیز کے لیے تھی۔ وہ ایک کامیاب مقرر تھے اس لیے کہ ان کے ہاں قول کا گہرا رشتہ ان کے عمل سے جڑا ہوا تھا۔ وہ نصب العینی خطابت کے شاہ سوار تھے۔ صفِ اوّل کے صحافی ہونے کے ناتے وہ دنیا کے جدید تر تغیرات سے آگاہ تھے اس کے ساتھ مذہب، ادب اور سیاست کی تاریخ کا کافی مطالعہ رکھتے تھے۔ وہ ایک بدیہہ گو شاعر تھے، الفاظ جن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ ایسے بدیہہ گو کے لیے جسے کبھی شعر کہنے کے لیے قلتِ الفاظ کا سامنا نہ ہوا ہو، نثری خطابت مشکل کام نہیں تھا۔ بدیہہ گوئی کے ساتھ ان کی شخصیت میں حاضر جوابی، برجستگی اور موقع کو پہچاننے کی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ ان کی زبان صاف، علی گڑھ اور حیدر آباد کی فضاؤں میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ان سب پر مستزاد ان کا اخلاص، مقصد کی لگن اور مشاہدہ تھا جنھوں نے مل کر انھیں فنِ خطابت کا شہسوار بنا دیا تھا۔

ایک مدت عوامی زندگی گزارنے کے باعث عوام کی نفسیات سے واقف اور انھیں متاثر کرنے کے فن سے آگاہ تھے۔ظفر علی خان بہ قول شورش کاشمیری ''اردو لہجہ میں حجازی نغمہ تھے'' ...... ''قلم کے دھنی اور زبان کے غنی تھے ان کی خطابت میں ضربِ یداللّٰہی کا بانکپن ہوتا وہ زبان ومحاورہ کے استاد تھے ان کے جملے دریا کی لہروں کی مانند رواں دواں ہوتے تھے'' ......وہ ''علی گڑھ کے لہجہ میں حیدرآباد کے شرفا کی زبان بولتے تھے ان کے لب ولہجہ میں دہلی ولکھنو کا رکھ رکھاؤ تھا'' ......وہ کہا کرتے تھے کہ ''عوام سامنے ہوں تو مضامین غیب سے پیدا ہوتے اور عوام تحسین کرتے ہوں تو نطق زبان کے بوسے لینے لگتا ہے'' [۲]

شورش مرحوم کو مولانا ظفر علی خان کا تلمّذ بھی حاصل تھا اور طویل عرصے تک ان کی صحبت بھی میسر رہی۔خود مولانا ظفر علی خان نے شورش سے اپنے رشتے کو 'ازلی' قرار دیا تھا۔ شورش نے مولانا کی خطابت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک مقرر میں جو خصائص ہونے چاہیئں۔وہ ان میں کما حقہ، موجود تھے، ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ روزمرہ اور محاورہ میں ٹھوکر نہیں کھاتے تھے۔ایک نوآموز مقرران کے الفاظ کا تعاقب کرنے سے اپنے الفاظ میں صحت پیدا کر لیتا ان کی تقریروں میں الفاظ کا حرف حرف نکھرتا چلا جاتا تھا۔وہ بدیہہ گو شاعر یا بدیہہ گو ادیب ہی نہیں بلکہ بدیہہ گو مقرر بھی تھے وہ تیاری اور موضوع کے مقابلہ میں زبان وبیان سے زیادہ قریب تھے وہ ایک حاضر ذہن مقرر تھے ...... ہر موضوع کو اپنے موضوع کو اپنے ڈھب پر لے آتے یا پھر اپنے موضوع کو ہر موضوع میں اتار لیتے۔''

وہ اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے عالم تھے اور انھوں نے بقولِ اقبال یوں تو سارے ہندوستان کو متاثر کیا لیکن مذہبی، ادبی اور سیاسی اعتبار سے صوبہ پنجاب کی بہت

بڑی خدمات انجام دیں ۳؎ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ایک جوشیلی شخصیت کے حامل تھے دراصل دیوانہ وار منزلوں کی سمت بڑھنے والے ہی غیر معمولی کارنامے انجام دیتے ہیں، خواجہ حسن نظامی نے اُن کی شخصیت کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا تھا ''عربی، فارسی، انگریزی اُردو کے بہت اچھے ماہر ہیں۔ نظم ونثر لکھنے میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے زیادہ رواں ہیں۔ قادرالکلام ہیں لیکن قادرالمزاج نہیں۔ بھک سے اُڑ جانے والی ایک قسم کی انسانی بارود ہیں۔ ان کی بول چال میں، لہجہ میں اور تحریر میں پنجابی اثر مطلق نہیں ہوتا مگر ان کی اُردو عرب سے بن کر آتی ہے اور فارس کے راستہ سے یہاں پہنچتی ہے، ہجو خوب لکھتے ہیں، ترجمہ کرنے میں ان کی برابری کوئی نہیں کرسکتا۔'' ۴؎

جلیانوالہ باغ کے حادثے سے رسوائی کمانے والے بدنام جنرل اوڈوائر نے اگرچہ مولانا ظفر علی خان کی خطابت کو سطحی (Frothy Oratory) قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی اثر پذیری سے انکار نہیں کرسکے، انھوں نے جہاں روزنامہ زمیندار کو آتشیں (Firebrand) اخبار قرار دیا وہاں مولانا کی خطابت کے حوالے سے بھی یہ اعتراف کیا کہ Both he and Zafar Ali Khan were born journalists and ...... brilliant masters of that frothy oratory that appeals to an Indian audience. ۵؎ ان کی زندگی ہنگاموں سے عبارت تھی، وہ ایک حسّاس لیکن شوخ طبع شخصیت تھے، شعر کہنا، اخبار نکالنا، تقریر کرنا، جیل جانا ان کی بنیادی مصروفیات میں سے تھے۔ انھوں نے لگ بھگ نصف صدی کی پبلک لائف میں تقریباً چودہ برس یعنی اپنی زندگی کا چھٹا حصہ جیل خانے میں گزارا (مولانا نے چوراسی برس عمر پائی)۔ اخبار کی ضبطوں، قرقیوں اور پابندیوں کے سلاسل اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی خطابت بھی اس ہنگامہ آرائی

سے خالی نہیں تھی۔ ایک زمانے میں پنجاب کی مشہور عوامی جماعت مجلسِ احرارِ اسلام سے منسلک تھے، پھر اختلاف ہو جانے کے باعث الگ ہو گئے اور جس شدت کے ساتھ اُس جماعت کی حمایت میں سرگرم تھے اس سے بڑھ کر مخالفت میں سرگرم ہوئے۔ مجلسِ احرار بھی خطیبوں اور واعظوں کی جماعت تھی، خطابت کے میدان میں ان کا مقابلہ آسان نہ تھا، ان کے پاس سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۱۸۹۲ء......۱۹۶۱ء) جیسا بے مثل خطیب تھا۔ ظفر علی خان نظم و نثر میں اُن کی شدید مخالفت کر رہے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ مخالفین کے جلسوں میں پہنچ کر اپنا موقف پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ انھوں نے اپنے روزنامچے میں ایک سفرِ دہلی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح ۶ر نومبر ۱۹۳۶ء کو ہونے والی فلسطین کانفرنس میں انھوں نے تقریر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ صدرِ محفل سے تقریر کی اجازت طلب کی گئی جس پر تامّل ظاہر ہوا، اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں ظفر علی خان تقریر شروع نہ کر دیں جلسہ برخاست کرنے کا اعلان کر دیا گیا لیکن ظفر علی خان نے اپنی جوشیلی آواز بلند کر کے مجمع کو روک لیا جس پر صدرِ محفل کو مجبوراً تقریر کی اجازت دینا پڑی۔ یہ رُوداد خود مولانا ظفر علی خان کے الفاظ میں دیکھیے، انھوں نے اس دن کا روزنامچہ لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> ''ڈھائی بجے فلسطین کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ مفتی کفایت اللہ نے استقبالیہ خطبہ پڑھا پھر سید سلیمان ندوی صدر کانفرنس کا خطبہ ہوا۔ اتنے میں مغرب کا وقت آ گیا میں نے ہلال احمد زبیری کی معرفت صدر سے دو منٹ کی تقریر کی اجازت چاہی کہ سب کو شہید گنج کانفرنس میں شرکت کی دعوت دوں۔ ہلال احمد زبیری نے مولانا احمد سعید سے کچھ کہا پھر سلیمان ندوی سے کچھ کہا میں پیچھے کھڑا تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا احمد سعید نے جلسہ کے برخاست ہونے کا اعلان کر دیا اس پر میں نے مجمع سے

جو کئی ہزار تھا بہ آوازِ بلند کہا کہ: بیٹھ جاؤ، میں نے صدر سے اجازتِ تقریر طلب کی ہے اس پر مجمع بیٹھ گیا اور صدر کو مجھے مجبوراً اجازت دینی پڑی۔ میں نے تقریر شروع کی اور شہید گنج کے متعلق مسلمانوں کو ان کے فرائض یاد دلائے۔ لوگوں نے بے انتہا جوش کا اظہار کیا اور سب نے شہید گنج کی بازیابی کی خاطر کٹ مرنے کے عزم کا اعلان کیا پھر میں نے علما کو مخاطب کیا اور کہا کہ میں آپ کو شہید گنج کانفرنس میں دعوتِ شرکت دیتا ہوں اب بھی آپ نہ آئے تو ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ اس وقت جلسہ میں مجمع پر [میں] چھایا ہوا تھا پلیٹ فارم پر ایک شخص کو کھڑا کر دیا گیا جس نے کہا کہ شہید گنج کا معاملہ تو خود میں نے ہی خراب کر دیا اس کا یہ کہنا تھا کہ تمام مجمع نے اس معترض کے خلاف غیظ و غضب کا مظاہرہ شروع کر دیا۔'' ٦

اپنے حامیوں اور عقیدت مندوں سے خطاب کرنا اور انھیں متاثر کرنا دشوار نہیں، عربی ضرب المثل کے مطابق کمال تو جب ہے کہ مخالف بھی آپ کا ہم نوا ہو جائے۔ الفضل ما شہدت بہ الاعدا (حُسن وہ ہے جس کا سوکنوں کو بھی اعتراف ہو) مولانا ظفر علی خان تُرکی ٹوپی پہنے ہوئے اورنگِ خطابت پر جلوہ فگن ہوتے تو اُن کی ٹوپی کے پھندنے کی حرکت جیسے جیسے تیز ہوتی مجمع کا رنگ بدلتا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ مخالف مجمع کو بھی اپنی مٹھی میں کر لیتے۔ مولانا ظفر علی خان کے سیکریٹری اور زمیندار کے رپورٹر کے طور پر کام کرنے والے صحافی محمد اشرف خان عطا نے اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے مذکورہ حیثیتوں سے مولانا کے ہمراہ پنجاب، سرحد، یوپی اور بنگال کا دورہ کیا اور دیکھا کہ:

''ایک ہی جلسہ میں عوام ظفر علی خان پر آوازے کس رہے ہیں، مخالفانہ مظاہرہ کر رہے ہیں، اینٹیں پتھر اور گارا پھینک رہے ہیں لیکن پندرہ بیس منٹ بعد وہی خشت باری اور دشنام طرازی کرنے والے لوگ ظفر علی خان زندہ باد کے نعرہ سے فضائے آسمانی میں

غلغلہ برپا کر رہے ہیں'' ے

اس مقام پر مناسب ہوگا کہ مولانا ظفر علی خان کی شعلہ بار تقریروں کے کچھ اقتباسات ہدیہء قارئین کیے جائیں تاکہ وہ مولانا ظفر علی خان کے اسلوبِ خطابت، عصری مسائل پر اُن کے خیالات کی نہج، فہم وفراست اور ان کی زبان و لہجے کا کچھ اندازہ کر سکیں:

لاہور میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی صدارت میں آزادی ہند کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے کہا:

''انگریز اقتدار کے نشہ میں اس بُری طرح بدمست ہیں کہ انھیں ابھی تک یہ احساس نہیں ہو رہا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ وہ ۱۹۳۶ء میں بھی ہم سے وہی سلوک کر رہا ہے جو اُس نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے کیا تھا۔ اس کو آج ۶۳ برس بعد بھی اس کا اندازہ نہیں ہو رہا کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہمارا کارواں سرگرم ہے۔ ہم اس مقام پر ہیں کہ اب ع

ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن ہم لچک سکتے نہیں

قدرت نے ہم میں ہمالہ کی بلندی، بحرِ ہند کی گہرائی اور گنگا و جمنا کی روانی پیدا کر دی ہے۔ ہمارا کارواں مرتّب ہو چکا ہے............ حُدی خوانوں کے نغمے ہیں۔ جوانی کی امنگ و ترنگ ہے اور ہم سے ٹکرانے والے نوٹ کر لیں کہ وہ ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ اپنی آزادی کے لیے ہم بے پناہ ہو گئے ہیں۔ ہم بنیانِ مرصوص ہیں۔ ہم نے اپنے اختلاف کی خلیج پاٹ دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ طاقت اپنی جگہ خالی کرنے کے لیے طاقت چاہتی ہے۔ انگریز کا ہندوستان سے نکل جانا مقدر ہو چکا ہے۔ ہم ایک طوفان کی طرح اُٹھیں گے اور اس کی سلطنت کے کرّ وفر کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جائیں گے۔ افسوس ان

ٹوڈیانِ کرام اور وفادارانِ عظام پر ہے جو انگریز کے اشارہ چشم و ابرو کی شہ پا کر مٹھی میں ہوا تھامتے اور آسمانوں میں تھگلی لگاتے ہیں۔ انھیں اس بدیہی حقیقت کا احساس ہی نہیں کہ برطانوی سلطنت ہندوستان کے لیے ایلوا ہو چکی ہے اور اس طرح محو ہو رہی ہے جس طرح صبح ہوتے ہی آنکھوں سے رات کا کاجل بہہ جاتا اور پیشانیوں سے قشقہ اُتر جاتا ہے۔'' ۸

فروری ۱۹۲۰ء میں ہونے والی خلافت کانفرنس برہان پور سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اسلام میں خلیفہ کی تعریف اس طرح پیش کی:

''خلیفہ وہ حاکم وقت ہے جو خدا کے وضع کیے ہوئے قوانین کے نفاذ پر مامور ہو اور امتثالِ امرِ باری کے لیے صاحبِ قلم ہونے کے ساتھ صاحبِ سیف بھی ہو۔ وہ پاپائے روما کی طرح مغربی روحانیت کا محض ایک تثلیثی پیکر نہیں ہے جو اپنے مخالفین کی دراز دستی کے جواب میں تکفیر کی ایک اینٹ یا بددعا کا ایک ڈھیلا ہی اپنے تقدس کے تھیلے میں سے نکال کر پھینکنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ خلیفہ اسلام کی ذمہ داریاں اس سے بہت زیادہ ہیں۔'' ۹

۸/اگست ۱۹۲۰ء کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

''میں راولپنڈی میں مدتوں کے بعد آیا ہوں جب پہلے آیا تھا تو اور حالت تھی مگر اب حالت اور ہے نہ وہ زمین پہلی سی ہے نہ وہ آسمان پہلا سا ہے ہوا میں تموّج اور قسم کا ہے تاروں کی دمک، آفتاب کی چمک، ماہتاب کی روشنی اور جلوہ اور ہی قسم کا ہے اب انسان کا دل و دماغ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا میرے عزیز ہم وطن بھائی پہلے غلام تھے محکوم تھے بندگی و عبودیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ آزاد نہ تھے مگر اب قدیم آزادی کی ہوا چل رہی ہے مسلمان اب خدا کی طرف دیکھ

رہے ہیں۔"

اسی تقریر میں انھوں نے عصری جھوٹ اور سچ کا موازنہ کرتے ہوئے کہا:

"میں لائیڈ جارج کی طرح منافق نہیں جس کی زبان میں شہد اور دل میں زہر ہو میں سچا ہوں جھوٹ نہیں بولتا اور سارے ہندوستانی سچے ہیں ہمارے ظاہر باطن کے ایک ہونے کا نتیجہ ہے کہ آپ تینتیس (۳۳) کروڑ نفوس پر امن و امان سے حکمران ہیں۔ لالہ لاجپت رائے جب ہندوستان سے نکل گئے تو انھوں نے کیا کیا۔ ایک کتاب لکھی جس میں صاف صاف اور کھری کھری باتیں کہہ دیں۔ اگر آپ ہماری زبان بندی کریں گے اگر آپ ہم پر بے جا سختیاں کریں گے اور ہمیں لائیڈ جارج بنا دیں گے تو نتیجہ کیا ہوگا ریا کاری پھیلے گی۔ یہاں بم بنیں گے پستول بنیں گے۔" [۱۰]

حیاتِ قومی کا راز بتاتے ہوئے انھوں نے کہا:

"دنیا میں کوئی جماعت یا قوم اُس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک اُس کی پُشت پر طاقت نہ ہو۔ وہ قومیں مٹ جایا کرتی ہیں جو اپنے بازوؤں کے بجائے غیروں کے بھروسہ پر جینے کی کوشش کرتی ہیں.......... معاہدات اور تحفظات اُس وقت تک بے معنی چیزیں ہیں، جب تک اُن کے پیچھے طاقت نہ ہو سیاست میں انصاف، خیر سگالی اور صاف دلی بے معنی الفاظ ہیں۔ سیاست، طاقت اور قوت کا نام ہے۔ دنیا کی قوموں پر نظر ڈالو اور دیکھو ہر روز اس کرہ ارضی پر کیا کچھ ہو رہا ہے، حبشہ کے ساتھ کیا ہوا، ہسپانیہ اور چین میں کیا ہوا اور فلسطین میں کیا کیا جا رہا ہے"

اجتماعی سطح پر قوت پیدا کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا:

"تمھارے اردگرد آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور مصیبتوں کے طوفان اُٹھ

رہے ہیں۔ تمھیں ان پر قابو پانے کے لیے بھاری قربانی دینی ہوگی اور شدید مصیبت برداشت کرنا ہوگی۔ تم شاندار روایات رکھتے ہو۔ تمھاری تاریخ درخشندہ ہے۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں، پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ دس کروڑ مسلمان مخالف طاقتوں سے ڈریں اور خوف زدہ ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تمھارا اتحاد و نظم وضبط اور جذبہ ایثار، قربانی بڑی سے بڑی مشکل پر بھی قابو پا سکتا ہے اور اکڑی سے اکڑی گردن کو بھی جھکا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مخالف طاقتیں متحد ہیں لیکن تمھارے ہاتھوں میں یداللّٰہی طاقت ہے۔ اس نازک اور پُر آشوب دور میں ایک فیصلہ کرنا ہے لیکن میں تمھیں کہتا ہوں، کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اُس پر سینکڑوں بار غور کرو۔ لیکن جب ایک فیصلہ پر پہنچ جاؤ تو پھر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اُس فیصلہ پر ڈٹ جاؤ۔ اگر آپ صدق دل سے کسی فیصلہ پر اڑ جائیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فتح دے گا۔"

مولانا ظفر علی خان ایک زمانے میں کانگریس کے ہم نوا اور مہاتما گاندھی کے مداح تھے لیکن بعدازاں انھوں نے کانگریس کی ہم نوائی اور گاندھی کی مدح دونوں سے ہاتھ اُٹھا لیے، پھر گاندھی کے بارے میں فرمایا:

"ستیہ اور اہنسا ہندو سنسکرتی کے دو معنوی سپوت ہیں جو اس دور کے سب سے بڑے سامری گاندھی نے اپنے سیاسی فلسفہ کی کوکھ سے پیدا کیے۔ بہ ظاہر گاندھی جی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً بڑے ہی کائیاں واقع ہوئے ہیں۔ اُن کا سیاسی منشا راس کماری سے لے کر سری نگر تک اور جمرود سے کلکتہ تک ہندو راج کا قیام ہے جس کو عرف عام میں رام راج یا سوراج کا نام دیا جاتا ہے۔ جن مسلمانوں کو رب کعبہ نے اپنے لطفِ عمومی سے ذوالفقارِ علیؓ عطا کی ہو۔ اُنھیں واردھا کے چرخے کی چرخ چوں سے زیر کرنے کے خواب دیکھنا جنابِ ابلیس علیہ ما علیہ کی خندہ

آدر شوخی نہیں تو اور کیا ہے۔ مسلمان تمام دنیا کو آزاد کرانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس ہندوستان میں ہمارا پرچم اقبال فضائے آسمانی کو بوسہ دیتا رہا ہے۔ آج بھی کشور کشائی اور جہان بانی ہمارے ہی مقدر کا نوشتہ ہیں۔ اگر گاندھی جی مسلمانوں کے ذوق بادیہ پیمائی اور جذبۂ کشور کشائی کو ستیہ اور اہنسا کا سیندور کھلانا چاہتے ہیں تو وہ ایک بہت بڑے واہمہ کا شکار ہیں ۔

پہلو میں ہو دل، دل میں ہو یقین، سر پر ہو کفن، کف میں ہو سناں
جب جمع یہ اجزا ہوتے ہیں بنتا ہے قوام آزادی کا
گاندھی کی نظر یثرب کی طرف اٹھ جاتی تو خیر اک بات بھی تھی
یہ کیا ہے کہ سمجھے بیٹھے ہیں وردھا کو مقام آزادی کا

''آزادی کی جدوجہد میں نوجوانانِ ملک وملّت کو خاک وخوں کے ہولناک طوفانوں سے گزر کر عروسِ آزادی سے ہم کنار ہونا پڑتا ہے۔ زندہ قوم جب کسی بات کا عزم کر لیتی تو گولیوں کی بوچھاڑ، توپوں کی دنادن، فوجوں کی یلغار، جیل کی تنگ وتاریک کوٹھڑیاں اور تختۂ دار اُن کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہیں سکتے۔ وہ ظلم واستبداد کی آندھیوں اور طوفانوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ وہ زنجیروں کی جھنکار سُن کر رقص کرتے ہیں۔ پھانسی کا رسّہ گلے میں ڈال کر زندگی کا منہ چڑاتے ہیں اور خوشی خوشی حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں کو قوم وملک کی مقدس امانت سمجھتے ہیں۔ وہ قوم وملک کی عزت ووقار کی خاطر زندہ رہتے ہیں اور اس کی خاطر ہی اپنی زندگیوں کو نچھاور کر دیتے ہیں۔ وہ خون کے طوفانوں سے گزر کر لاشوں کو روندتے، گولیوں سے کھیلتے، ظلم واستبداد پر مسکراتے اور سینوں پر زخم پر

زخم کھاتے منزل آزادی کی طرف اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔''

''انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اس کا پیدائشی حق ہے۔ اس حق کو منوانے کے لیے کسی جابر و قہار حکمران کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہیے۔ انسان کا سر صرف خدائے لم یزل کے روبرو جھکنا چاہیے کیونکہ وہی عبادت کے قابل ہے۔ انسان خدا کی پرستش کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ خدائے لایزال کے ماسوا کسی دوسرے کی پرستش اور عبادت کرنا حرام ہے، کفر ہے۔''

''توحید کے پرستار اور کلمہ گو مشرق میں آباد ہوں یا مغرب میں، شمال کے رہنے والے ہوں یا جنوب کے باسی، ہندی ہوں یا افغان، عرب ہوں یا عجم سے تعلق رکھنے والے، ترک ہوں یا انڈونیشین سب بھائی بھائی ہیں۔ اگر عجمی کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو عرب کو درد محسوس ہونا چاہیے۔ اگر ترک پر آفت آئے تو ہندی کو اُن کی مصیبت میں برابر کا شریک ہونا چاہیے۔''[11]

''ہماری قومی قوتیں پراگندہ ہو رہی ہیں۔ نہایت قیمتی مواد موجود ہے، لیکن اُس سے کام نہیں لیا جاتا۔ متوسّط اور ادنیٰ طبقہ کے مسلمانوں میں کہ یہی ہماری قومیت کا جزوِ اعظم ہیں، جوش، خلوص، ایثار، حرارتِ دینی اور حُبِ قومی سب کچھ ہے۔ لیکن اس کی مثال اُس دریا کی ہے، جس کی طغیانیاں چٹانوں سے ٹکرا کر یا ریگستانوں میں جذب ہو کر بے کار جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر اسی دریا میں بند باندھ دیے جائیں، پشتے بنا دیے جائیں، نہریں کاٹ دی جائیں، تو کلّر گلزار ہو سکتے ہیں، ویرانے آبادیاں بن سکتی ہیں، اور خار و خس کی جگہ لالہ و گل نمودار ہو سکتے ہیں۔ انسان مدنی الطبع ہے، اور اسلام تو مدنیت کی جان واقع ہوا ہے۔ ایک خیال، ایک طبیعت اور ایک وضع کے افراد کا متحد المقاصد ہو جانا بہت ہی آسان ہے۔ صرف ذرا سی تحریک کی دیر ہے۔ مسلمانوں کا نظام اجتماعی جس کا شیرازہ قرآن حکیم ہے، مدون ہو چکا ہے۔''[12]

﴿3﴾

مولانا ظفر علی خان کی خطیبانہ زندگی کا دائرہ نصف صدی تک پھیلا ہوا ہے، یہ چند اقتباسات کسی طرح ان کی شعلہ باریوں اور گرم گفتاریوں کے نمائندہ نہیں ہو سکتے، یوں بھی تقریر سننے سے تعلق رکھتی ہے، سماعتوں میں رس گھولنے اور فضاؤں میں شعلے بکھیرنے والے الفاظ کاغذ پر اُترتے ہیں تو سرد ہو کر رہ جاتے ہیں، تاہم اب ان کی خطابت سے تعارف کا اس کے سوا کوئی ذریعہ باقی نہیں کہ ہم اُسے ماضی کے خزینوں سے دریافت کریں۔ ان کی زندگی کے مجمل ترین خاکے پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ ان کی سیاسی، صحافتی اور ملّی مصروفیات میں اپنی تقریروں کا ریکارڈ رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اور یوں بھی ظفر علی خاں کا مزاج ارتکاز سے زیادہ پھیلاؤ کی طرف مائل تھا۔ ان کی تحریریں تو ایک حد تک محفوظ ہو چکی ہیں (اگرچہ آج کے قاری کی دسترس سے دور ہیں) لیکن ان کی تقاریر کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جا سکا جبکہ ظفر علی خاں کو ہم سے رخصت ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اب ان کی زندگی کے نقوش کی فراہمی دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔ تاہم اس عہد کا جس قدر ریکارڈ موجود ہے ہم نے اس کی مدد سے ظفر علی خاں کی تقاریر کی یہ فہرست تیار کی ہے، جو آئندہ اوراق میں پیش کی جا رہی ہے، یہ فہرست اپنی جگہ مکمل تو نہیں ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ مستقبل کا مورخ اس فہرست کو اپنا راہ نما بنا کر، ظفر علی خاں کا سرمایۂ گفتار محفوظ کر لے گا۔

حواشی میں، ان مقامات کی نشاندہی کر دی گئی ہے جہاں یہ تقاریر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں یا ان کا حوالہ موجود ہے۔

شمار	موضوع	مقام	تاریخ
۱	جنگ بلقان اور مسلمانان لاہور [۱۳]	لاہور	۷ نومبر ۱۹۱۲ء

۲	خطبہ صدارت خلافت کانفرنس [۱۴]	برہان پور	۱۹۲۰ء
۳	ریلوے ملازمین کی ہڑتال [۱۵]		اپریل ۱۹۲۰ء
۴	خطبہ صدارت جلسہ خلافت [۱۶]	لاہور	مئی ۱۹۲۰ء
۵	جلسہ خلافت [۱۷]	لاہور	مئی ۱۹۲۰ء
۶	مسئلہ خلافت [۱۸]	سہارن پور	جون ۱۹۲۰ء
۷	خلافت اور یوم عید [۱۹]	لاہور	جون ۱۹۲۰ء
۸	قرارداد خلافت [۲۰]	سیالکوٹ	جولائی ۱۹۲۰ء
۹	عوامی جلسہ [۲۱]	لاہور	۲۳ جولائی ۱۹۲۰ء
۱۰	مہاجرین کو الوداع [۲۲]	لاہور	جولائی ۱۹۲۰ء
۱۱	خلافت اور ترکی [۲۳]	راولپنڈی	۱۸ اگست ۱۹۲۰ء
۱۲	مسئلہ خلافت اور خلافت کمیٹی [۲۴]	چکوال	اگست ۱۹۲۰ء
۱۳	حکومت سے عدم تعاون [۲۵]	مری	اگست ۱۹۲۰ء
۱۴	جلسہ خلافت [۲۶]	راولپنڈی	۱۱۸گست ۱۹۲۰ء
۱۵	عدم تعاون [۲۷]	کلکتہ	۱۰ ستمبر ۱۹۲۰ء
۱۶	پیغام عمل، مسلمانوں کے نام [۲۸]	-------	نومبر ۱۹۲۴ء
۱۷	عوامی جلسہ [۲۹]	راولپنڈی	نومبر ۱۹۲۴ء
۱۸	خطبہ صدارت صوبائی خلافت کانفرنس پنجاب [۳۰]	امرتسر	۵/دسمبر ۱۹۲۴ء
۱۹	عوامی جلسہ [۳۱]	راولپنڈی	دسمبر ۱۹۲۴ء
۲۰	اتحاد بین المسلمین (اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ) [۳۲]	؟	۷ جنوری ۱۹۲۵ء
۲۱	خطاب، اجلاس مجلس خلافت پنجاب [۳۳]	لاہور	۱۱ فروری ۱۹۲۵ء
۲۲	اجلاس مسلمانان لاہور بسلسلہ خلافت [۳۴]	لاہور	فروری ۱۹۲۵ء
۲۳	جلسہ تنظیم [illegible] اسلامیہ کالج پشاور [۳۵]	پشاور	۱۹۲۵ء

نمبر	عنوان	مقام	تاریخ
۲۴	مجلس خلافت کا اجلاس ۳۶	پشاور	فروری ۱۹۲۵ء
۲۵	سرزمین بے آئین ۳۷	لاہور	۵ مارچ ۱۹۲۵ء
۲۶	خطاب طلبائے اسلامیہ کالج ۳۸	لاہور	۱۲ اپریل ۱۹۲۵ء
۲۷	پیام حیات ۳۹	امرتسر	مئی ۱۹۲۵ء
۲۸	ہنگامہ پانی پت ۴۰	پانی پت	۱۸ محرم ۱۹۲۵ء
۲۹	بیت اللہ الحرام کے صحیح حالات ۴۱	لاہور	مئی ۱۹۲۵ء
۳۰	امسال کا حج ۴۲	سیالکوٹ	مئی ۱۹۲۵ء
۳۱	رابغ کا خلاف گولہ باری ۴۳	لاہور	جون ۱۹۲۵ء
۳۲	دیس بندھو کا انتقال (تعزیتی جلسہ) ۴۴	(؟)	جون ۱۹۲۵ء
۳۳	مشعل ہدایت ۴۵	کہوٹہ	جون ۱۹۲۵ء
۳۴	روضہ مطہرہ پہ گولہ باری کی حقیقت ۴۶	لاہور	اگست ۱۹۲۵ء
۳۵	خطبہ صدارت بہار پراونشل اردو کانفرنس ۴۷	بہار	اکتوبر ۱۹۲۵ء
۳۶	اجلاس مسلمانان پٹنہ ۴۸	پٹنہ	اکتوبر ۱۹۲۵ء
۳۷	وراثت موعودہ (جلسہ اہل دہلی) ۴۹	دہلی	اکتوبر ۱۹۲۵ء
۳۸	اجلاس مسلمانان کانپور ۵۰	کانپور	اکتوبر ۱۹۲۵ء
۳۹	شیر شاہ سوری کا مزار ۵۱		اکتوبر ۱۹۲۵ء
۴۰	اجلاس مسلمانان فرخ آباد ۵۲	فرخ آباد	اکتوبر ۱۹۲۵ء
۴۱	درس توحید ۵۳	لدھیانہ	ستمبر ۱۹۲۵ء
۴۲	الوداعی اجلاس بہ اعزاز ظفر علی خاں ۵۴		اکتوبر ۱۹۲۵ء
۴۳	اجلاس مسلمانان کانپور ۵۵	کانپور	۲۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء
۴۴	اردو کی اہمیت ۵۶		فروری ۱۹۲۶ء
۴۵	خطاب با جلاس انجمن مسلم راجپوتان ۵۷		مارچ ۱۹۲۶ء

۴۶	کوائف حجاز کی توضیح [۵۸]	لائل پور	مارچ ۱۹۲۶ء
۴۷	اجلاس انجمن اشاعت اسلام [۵۹]	جالندھر	مئی ۱۹۲۶ء
۴۸	اجلاس مسلمانان دہلی [۶۰]	دہلی	دسمبر ۱۹۲۶ء
۴۹	اجلاس مسلمانان گوجرانوالہ [۶۱]	گوجرانوالہ	فروری ۱۹۲۷ء
۵۰	یوم عدالت عالیہ [۶۲]	امرتسر	مئی ۱۹۲۷ء
۵۱	خطبہ صدارت اجلاس مجلس خلافت [۶۳]	(؟)	۱۳ اگست ۱۹۲۷ء
۵۲	سائمن کمیشن کا مقاطعہ [۶۴]	لاہور	۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ء
۵۳	سائمن کمیشن کا مقاطعہ [۶۵]	لاہور	۹ مارچ ۱۹۲۸ء
۵۴	سائمن کمیشن کا مقاطعہ خطبہ صدارت [۶۶]	لاہور	۱۱ مارچ ۱۹۲۸ء
۵۵	عربی ممالک کا اتحاد کس طرح ممکن ہے [۶۷]	قاہرہ	اگست ۱۹۲۸ء
۵۶	یوم ولادت مہاتما گاندھی (جلسہ جمعیۃ الطلبہ) [۶۸]	لاہور	اکتوبر ۱۹۲۸ء
۵۷	خطاب پنجاب پراونشل پولیٹیکل کانفرنس [۶۹]	لاہلپور	اکتوبر ۱۹۲۸ء
۵۸	افغانستان کی صورت حال [۷۰]	لاہور	۲ جنوری ۱۹۲۹ء
۵۹	جلسہ سٹی کانگرس کمیٹی موچی دروازہ [۷۱]	لاہور	فروری ۱۹۲۹ء
۶۰	حکومت برطانیہ کو جنگ کے خلاف انتباہ [۷۲]	روالپنڈی	فروری ۱۹۲۹ء
۶۱	اجلاس میدان ٹانچی [۷۳]	لدھیانہ	فروری ۱۹۲۹ء
۶۲	اجلاس شاہی باغ سرحد [۷۴]	(؟)	۲۷ فروری ۱۹۲۹ء
۶۳	اجلاس زمیندارہ لیگ [۷۵]	گجرات	مئی ۱۹۳۱ء
۶۴	سالانہ اجلاس انجمن نوجوانان اسلام جموں [۷۶]	جموں	مئی ۱۹۳۱ء
۶۵	اجلاس کانگرس [۷۷]	بنگلور	اگست ۱۹۳۱ء
۶۶	پنجاب و بنگال کی اکثریت کا تحفظ' خطبہ صدارت [۷۸]	لاہور	۸ جولائی ۱۹۳۲ء
۶۷	جلسہ اہل اسلام [۷۹]	بدایوں	اکتوبر ۱۹۳۲ء

نمبر	عنوان	مقام	شہر	تاریخ
	تجدید و تشکیل آل انڈیا کشمیر کمیٹی ۸۰		لاہور	۲جولائی ۱۹۳۳ء
۶۸	تبلیغ کانفرنس ۸۱	چونڈہ	سیالکوٹ	یکم اپریل ۱۹۳۵ء
۶۹	تبلیغ کانفرنس ۸۲		جموں	۱۲اپریل ۱۹۳۵ء
۷۰	اجلاس ۸۳		شاہ آباد	مئی ۱۹۳۵ء
۷۱	جواب سپاسنامہ اہلِ رنگون ۸۴		رنگون	۲۱/اگست ۱۹۳۶ء
۷۲	مسجد شہید گنج ۸۵		رنگون	۲۱/اگست ۱۹۳۶ء
۷۳	خاکساروں کے اسلامی فرائض ۸۶		رنگون	۲۲/اگست ۱۹۳۶ء
۷۴	توحید ۸۷	مدرسہ زینت الاسلام	رنگون	۲۳/اگست ۱۹۳۶ء
۷۵	مجلس اتحادِ ملت کے اغراض و مقاصد اور اس کا کشور گیر			
۷۶	نظام نیز مسلمانان برما کا مستقبل ۸۸	عارف ہال	رنگون	۲۵/اگست ۱۹۳۶ء
۷۷	خطبہ صدارت مشاعرہ بزم ادب (شاعری کے مقاصد نیز برما میں فروغ اُردو) ۸۹		رنگون	۲۷/اگست ۱۹۳۶ء
۷۸	اسلام میں عورت کا درجہ اور اس کے حقوق ۹۰	سورتی مسجد	رنگون	۲۸/اگست ۱۹۳۶ء
۷۹	مجلس اتحاد ملت کی چندہ مہم ۹۱	منی گارڈن	رنگون	۲۹/اگست ۱۹۳۶ء
۸۰	جواب سپاس نامہ: مقاصد اتحاد ملت ۹۲	جوبلی ریستوران	رنگون	۳/ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۱	برکات اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ حالت اور ان کا مستقبل ۹۳		رنگون	۴/ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۲	حضرت امام حسینؓ...... واقعہ کربلا کا فلسفہ اور مسلمانوں کے موجودہ فرائض ۹۴	مسلم طلبہ ایسوسی ایشن	رنگون	۱۰/ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۳	دنیا کی بین الاقوامی سیاست ۹۵	زیر بادیوں کی مسجد	رنگون	۱۱/ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۴	اسلام کا پیغام ۹۶	راندیریہ ہائی سکول	رنگون	۱۵/ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۵	تقریر جلسہ بہ اعزاز مولانا ظفر علی خاں ۹۷	مسلم ایسوسی ایشن	رنگون	۱۶/ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۶	تقریر اتحاد ملت مہم ۹۸	مسجد تمائین	تمائین	۱۷/ستمبر ۱۹۳۶ء

۸۷	تبلیغی جلسہ	۹۹	مسجد تمائین	تمائین	۱۸ ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۸	جلسہ	۱۰۰	مسجد تمائین	تمائین	۱۹ ستمبر ۱۹۳۶ء
۸۹	مجلس اتحادِ ملت کا پیغام	۱۰۱	مسلم چولیا ایسوسی ایشن	رنگون	۲۰/ستمبر ۱۹۳۶ء
۹۰	مجلس اتحادِ ملت کا پیغام	۱۰۲	مسجد تمائین	رنگون	۲۱/ستمبر ۱۹۳۶ء
۹۱	ایضاً	۱۰۳	بنگالی مسجد	رنگون	۲۵/ستمبر ۱۹۳۶ء
۹۲	ایضاً	۱۰۴	اسلامیہ ہائی سکول	رنگون	۲۵/ستمبر ۱۹۳۶ء
۹۳	ایضاً	۱۰۵	مسجد تھیانگ شو	رنگون	۲۶/ستمبر ۱۹۳۶ء
۹۴	الکاسب حبیب اللہ	۱۰۶	مدرسہ زینت الاسلام	رنگون	۳۰/ستمبر ۱۹۳۶ء
۹۵	مجلس اتحادِ ملت	۱۰۷		رنگون	یکم/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۹۶	گاندھی کی اڑسٹھویں سالگرہ سیاسیات حاضرہ اور مسلمانوں کی زندگی	۱۰۸	وائی ایم ایس اے ہال	رنگون	۲/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۹۷	اخوت اسلامی برمکان حاجی ہاشم	۱۰۹		رنگون	۴/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۹۸	الوداعی جلسہ	۱۱۰	مسلم سٹوڈنٹس سوسائٹی	رنگون	۵/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۹۹	جلسہ برمکان حافظ محمد صدیق	۱۱۱	چیئرمین میونسپلٹی کانپور	الٰہ آباد	۱۰/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۰	اتحاد ملت	۱۱۲	جامع مسجد شفیع آباد	کانپور	۱۱/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۱	معراج کی برکات اور حالات حاضرہ	۱۱۳	پریڈ گراؤنڈ	کانپور	۱۲/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۲	سیرت النبیؐ اور جلسہ شب معراج	۱۱۴		کانپور	۱۳/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۳	شہید گنج	۱۱۵	انجمن خدام المسلمین	کانپور	۱۴/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۴	مسائلِ حاضرہ	۱۱۶	مسلم یونی ورسٹی یونین	علی گڑھ	۱۵/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۵	اتحاد ملت کا پروگرام	۱۱۷	جامعہ مسجد	علی گڑھ	۱۶/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۶	دعوت چائے میں تقریر	۱۱۸	عثمانیہ ہوسٹل	علی گڑھ	۱۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۷	شہید گنج اور کرم آباد کی مساجد	۱۱۹		کنجاہ	۲۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء

۱۰۸	بعد نماز جمعہ تقریر اتحاد ملت [۱۲۰]	جامع مسجد کرم آباد	۲۳/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۰۹	اتحاد ملت [۱۲۱]	جامع مسجد کنجاہ	۲۳/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۱۰	صدارتی تقریر جامعہ اسلامیہ [۱۲۲]	امرتسر	۲۹/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۱۱	انگریزوں کی عالمی پالیسی [۱۲۳]	مسجد پشاور	۳۱/اکتوبر ۱۹۳۶ء
۱۱۲	تبلیغ کانفرنس [۱۲۴]	پشاور	یکم/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۱۳	ایضاً [۱۲۵]	مسجد نوشہرہ چھاؤنی	یکم/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۱۴	شہید گنج [۱۲۶]	جامع مسجد کمبل پور	یکم/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۱۵	ایضاً [۱۲۷]	یکی دروازہ لاہور	۴/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۱۶	جلسہ تقسیم اسناد مدرسہ نعمانیہ [۱۲۸]	مسجد فتح پوری دہلی	۶/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۱۷	مسجد شہید گنج [۱۲۹]	مسجد فتح پوری دہلی	۷/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۱۸	مسئلہ فلسطین پر برطانوی مال کا مقاطعہ [۱۳۰]	دہلی	۷/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۱۹	فلسطین کانفرنس کا مقاطعہ [۱۳۱]	دہلی	۸/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۲۰	تقریر انجمن ظفر الاسلام [۱۳۲]	جالندھر	۱۰/نومبر ۱۹۳۶ء
۱۲۱	کانگرس کی حقیقت [۱۳۳]	مراد آباد	یکم جولائی ۱۹۳۷ء
۱۲۲	انتخابی جلسہ مسلم لیگ [۱۳۴]	بلند شہر	۲۲ دسمبر ۱۹۳۷ء
۱۲۳	خطبہ صدارت یوم محمد علی [۱۳۵]	اسلامیہ کالج لاہور	۴ جنوری ۱۹۳۸ء
۱۲۴	اسلامی جلسہ [۱۳۶]	مینہانہ (میوات)	۵ مارچ ۱۹۳۸ء
۱۲۵	اہل اسلام کا جلسہ [۱۳۷]	کلکتہ	۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء
۱۲۶	عوامی جلسہ [۱۳۸]	کلکتہ	۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء
۱۲۷	اسلامی جلسہ [۱۳۹]	کھاریاں	۴ جولائی ۱۹۳۸ء
۱۲۸	مسلم لیگ کانفرنس [۱۴۰]	مردان	۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء
۱۲۹	جلسہ انجمن اسلامیہ [۱۴۱]	صندل ہال شملہ	اگست ۱۹۳۸ء

۱۳۰	اجلاس مسلم لیگ ۱۴۲	کشن گنج	بہار	۳ مئی ۱۹۳۹ء
۱۳۱	اجلاس مسلم لیگ ۱۴۳		بھاگلپور	۴ مئی ۱۹۳۹ء
۱۳۲	اجلاس مسلم لیگ ۱۴۴		مونی ہاری	۱۵ مئی ۱۹۳۹ء
۱۳۳	اجلاس مسلم لیگ قرارداد پاکستان ۱۴۵		لاہور	۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء
۱۳۴	جلسہ سٹی مسلم لیگ ۱۴۶		سیالکوٹ	۱۸ اپریل ۱۹۴۰ء
۱۳۵	فنانس بل پہ تقریر (مجلس وضع قوانین) ۱۴۷		دہلی	۱۴ مارچ ۱۹۴۱ء
۱۳۶	پاکستان کانفرنس مسلم لیگ ۱۴۸		علی گڑھ	۲۲/مارچ ۱۹۴۲ء
۱۳۷	بہ سلسلہ پاکستان کانفرنس ۱۴۹	جامعہ مسجد	علی گڑھ	۲۳/مارچ ۱۹۴۲ء
۱۳۸	پاکستان مسلم لیگ سکندرآباد ۱۵۰		بلندشہر	۶/اپریل ۱۹۴۲ء
۱۳۹	اسلام کے احسانات اور سیرت النبیؐ ۱۵۱	چھپراندی	اجبن	۹/اپریل ۱۹۴۲ء
۱۴۰	مسائل حاضرہ ۱۵۲	مسلم کانفرنس	جموں وکشمیر	۱۷/اپریل ۱۹۴۲ء
۱۴۱	ایضاً ۱۵۳		ایضاً	۱۸/اپریل ۱۹۴۲ء
۱۴۲	پاکستان ۱۵۴		ایضاً	۱۹/اپریل ۱۹۴۲ء
۱۴۳	اردو کانفرنس پنجاب یونیورسٹی ۱۵۵		لاہور	۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء

حوالے اور حواشی

۱۔ بحوالہ شورش کاشمیری فنِ خطابت لاہور: مطبوعاتِ چٹان ۱۹۸۲ء ص ۴۲

۲۔ محولہ بالا ص ص ۸۵، ۲۷، ۷۷، ۱۰۰

۳۔ مولانا ظفر علی خان سے متعلق اقبال نے یہ تاثر ۲۹/ جنوری ۱۹۳۶ء کو ظاہر کیا جو روزنامہ احسان کے ظفر علی خان نمبر میں شائع ہوا۔ اب دیکھیے اشرف عطا مولانا ظفر علی خان لاہور: مکتبہ کارواں س ن ص ۷ ظفر علی خان کے بارے میں اقبال نے اپنی مختلف تحریروں میں اچھی رائے ظاہر کی ہے، مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام ۱۰/ اپریل ۱۹۱۸ء کے خط میں انھوں نے لکھا: ''[ظفر علی خان] نہایت قابل آدمی ہیں اور ان کا ذہن مثل برق کے تیز ہے'' محمد عبداللہ قریشی (مرتب) اقبال بنام شاد لاہور بزم اقبال ۱۹۸۶ء ص ۲۴۴ اس موضوع پر پروفیسر جعفر بلوچ صاحب ایک مستقل کتاب اقبال اور ظفر علی خان لکھ چکے ہیں (لاہور اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۵ء)

۴۔ اشرف عطا محولہ بالا ص ۹

۵۔ مائیکل اوڈوائر کے تاثرات کو مختلف اُردو مصنفین نے اپنے اپنے رنگ میں پیش کیا ہے مثلاً مولانا کوثر نیازی نے یوں ترجمانی کی ہے: ''ظفر علی خان تقریر نہیں کرتے انگارے برساتے ہیں'' (اندازِ بیاں لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۵ء ص ۸۰) اشرف عطا نے اپنی محولہ بالا کتاب میں اوڈوائر کے خیالات کو یوں اُردو میں منتقل کیا ہے ''اگر میں اس رسوائے عالم، آتش بیان، باغی ظفر علی خان کو پکڑ کر جیل کی بند کوٹھری میں بند نہ کرتا تو اس برصغیر میں برطانوی نظامِ حکومت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیتا'' (ص ۲۸۵)
سر مائیکل اوڈوائر کی انگریزی کتاب کا ایک اقتباس (Page 175) مضمون میں پیش کیا جا چکا ہے، دوسرا اقتباس درج ذیل ہے:

The views of this section were expressed in a very fiery newspaper (the *Zamindar*) edited by a notorious firebrand,

Zafar Ali Khan.(Page 172)

Both he and Zafar Ali Khan were born journalists and brilliant masters of that frothy oratory that appeals to an Indian audience.(Page 175)

O'Dwyer, Sir Michael *India as I knew it* 1885-1925 London Constable & Company Ltd. 1925.

۶ مولانا ظفر علی خان کا غیر مطبوعہ روزنامچہ مرقومہ ۶ رنومبر ۱۹۳۶ء (دیکھیے: ظفر علی خان کی غیر مطبوعہ تحریریں مقالہ برائے ایم۔فل اُردو از ریحانہ خاتون اسلام آباد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۹۲ء۔۱۹۹۳ء ص ۲۱۶

۷ اشرف عطا محولہ بالا ص ۹۳

۸ فنِ خطابت محولہ بالا ص ۷۷۔۷۸

۹ مشاق احمد کوٹلہ (مرتب) خطبات صدارت فدائے ملّت مولانا ظفر علی خان کوٹلہ: قومی دارالاشاعت ۱۹۲۱ء ص ۴۔۵

۱۰ ایضاً ص ۴۴

۱۱ اشرف عطا محولہ بالا ص ص ۱۶۳۔۱۶۶

۱۲ ظفر علی خان روحِ معانی برہان پور ۱۳۳۹ھ مشمولہ مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار از پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء ص ۶۴۷

۱۳ روزنامہ زمیندار لاہور ۸ رنومبر ۱۹۱۲ء

۱۴ خطباتِ صدارت محولہ بالا ص ۲

یہ خطبہ کتابچے کی صورت میں الگ بھی شائع ہوا جس کا نام روحِ معانی رکھا گیا اشاعت ۱۳۳۹ھ۔ اب نایاب ہے

۱۵ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۵ راپریل ص ۴

۱۶ روزنامہ زمیندار لاہور ۹ مئی ۱۹۲۰ء ص ۴

خطباتِ صدارت محولہ بالا ص ۳۴

۱۷۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۵/جون ۱۹۲۰ء ص ۴

۱۸۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۹ جون ۱۹۲۰ء ص ۳

۱۹۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۴/جولائی ۱۹۲۰ء ص ۳

۲۰۔ خطباتِ صدارت محولہ بالا ص ۳۷

۲۱۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء ص ۳،۴

۲۲۔ خطباتِ صدارت محولہ بالا ص ۳۵

۲۳۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۳/اگست ۱۹۲۰ء ص ۴

۲۴۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۵/اگست ۱۹۲۰ء ص ۳

۲۵۔ روزنامہ زمیندار لاہور ص ۲، امنقول شانتی راولپنڈی

۲۶۔ خطباتِ صدارت محولہ بالا ص ۵۳

۲۷۔ مشتاق احمد کے کتابچے' خطباتِ صدارت کے حوالے سے اوپر جو تقاریر درج کی گئی ہیں خطباتِ صدارت میں ان پر سنہ ۱۹۲۱ء درج ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کو ۱۵/ستمبر ۱۹۲۰ء کو لاہور سے گرفتار کر کے منٹگمری جیل بھجوا دیا گیا تھا۔ جہاں چار سال قید بامشقت گزار کر وہ ۵/نومبر ۱۹۲۴ء کو رہا ہوئے، یہ زمانہ ان کی اسارت کا ہے اس لیے یہ تقاریر ۱۹۲۱ء کی نہیں ہو سکتیں۔ اغلب ہے اور اس عہد کا سیاسی منظر نامہ اس گمان کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ تقاریر ۱۹۲۰ء کی ہیں۔ اس لیے ہم نے خطباتِ صدارت میں مندرج سنہ کو کتابت کی غلطی تصور کرتے ہوئے ان تقاریر کو ۱۹۲۰ء میں شمار کیا ہے۔

۲۸۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۹ نومبر ۱۹۲۴ء ص ۴،۵

۲۹۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۱ نومبر ۱۹۲۴ء ص ۳

۳۰۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۰ دسمبر ۱۹۲۴ء ص ۲،۱---۶

۳۱۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۵/دسمبر ۱۹۲۴ء ص ۳---۵

۳۲۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۸/جنوری ۱۹۲۵ء ص ۳

۳۳۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۲/فروری ۱۹۲۵ء ص ۱،۳

۳۴۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۸/فروری ۱۹۲۵ء ص ۴

۳۵ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۶ فروری ۱۹۲۵ء ص ۳

۳۶ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۷ فروری ۱۹۲۵ء ص ۴

۳۷ روزنامہ زمیندار لاہور ۵ مارچ ۱۹۲۵ء ص ۳

۳۸ روزنامہ زمیندار لاہور ۵، ۱۶ اپریل ۱۹۲۵ء ص ۳، ۴

۳۹ یہ خطاب کتابچے کی صورت میں ہوا۔ ''پیغامِ حیات'' نامی کتابچہ اب نایاب ہے
روزنامہ زمیندار لاہور ۲۳ مئی ۱۹۲۵ء ص ۱

۴۰ ظفر علی خاں کے سوانح نگاروں کے ہاں اس کا ذکر ملتا ہے ہمیں تقریر دستیاب نہیں ہوئی۔

۴۱ روزنامہ زمیندار لاہور ۴ مئی ۱۹۲۵ء ص ۳

۴۲ روزنامہ زمیندار لاہور ۹ مئی ۱۹۲۵ء ص ۴

۴۳ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۶ جون ۱۹۲۵ء ص ۴

۴۴ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۸ جون ۱۹۲۵ء ص ۳
۲۰ جون ۱۹۲۵ء ص ۴،

۴۵ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۶ جون ۱۹۲۵ء ص ۴، ۵

۴۶ روزنامہ زمیندار لاہور یکم ستمبر ۱۹۲۵ء ص ۴، ۵

۴۷ روزنامہ زمیندار لاہور ۲/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۱، ۴

۴۸ روزنامہ زمیندار لاہور ۲/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۲، ص ۵

۴۹ روزنامہ زمیندار لاہور ۸/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۳

۵۰ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۰/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۳

۵۱ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۳/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۱

۵۲ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۹/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۴

۵۳ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۸/ ستمبر ۱۹۲۵ء ص ۳، ۴

۵۴ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۰/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۴

۵۵ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۰/ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۱۔ ۲۱/ اکتوبر ص ۲، ۷

۵۶ حوالہ بالا

۵۷۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۶ مارچ ۱۹۲۶ء ص ۳

۵۸۔ حوالہ بالا جائے مذکور

۵۹۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۵ مئی ۱۹۲۶ء ص ۲

۶۰۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۱ دسمبر ۱۹۲۶ء ص ۳

۶۱۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۱ فروری ۱۹۲۷ء ص ۱

۶۲۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء ص ۴

۶۳۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۵ اگست ۱۹۲۷ء ص ۳

۶۴۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء ص ۱

۶۵۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۲۸ء

۶۶۔ حوالہ بالا ص ۶

۶۷۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۹ اگست ۱۹۲۸ء ص ۲

۶۸۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء ص ۴

۶۹۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۸ء

۷۰۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء ص ۴

۷۱۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۲ فروری ۱۹۲۹ء

۷۲۔ حوالہ بالا ص ۲

۷۳۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۸ فروری ۱۹۲۹ء ص ۲

۷۴۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۶ مارچ ۱۹۲۹ء ص ۱

۷۵۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۲ مئی ۱۹۳۱ء ص ۲

۷۶۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۳/ مئی ۱۹۳۱ء ص ۱

۷۷۔ بحوالہ نگارستان مجموعہ کلام ظفر علی خاں لاہور پبلشرز یونائیٹڈ س-ن-ص ۱۰۷

۷۸۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۹ جولائی ۱۹۳۲ء ص ۴

۷۹۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۶/ اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۳

۸۰۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۰/ جولائی ۱۹۳۳ء ص ۴

۸۱؎ نگارستان ص۲۲۱

۸۲؎ بحوالہ نگارستان ص۲۲۲

۱۲ر مئی ۱۹۳۵ء ص۲

روزنامہ زمیندار لاہور

۸۳؎ روزنامچہ مولانا ظفر علی خان (غیر مطبوعہ) مورخہ ۲۱ر اگست ۱۹۳۶ء بحوالہ مولانا ظفر علی خان کی

۸۴؎ غیر مطبوعہ تحریریں محولہ بالا ص ۱۲۷

۸۵؎ ایضاً جائے مذکور

۸۶؎ ایضاً ص ۱۲۸

۸۷؎ ایضاً ص ۱۳۰

۸۸؎ ایضاً ص ۱۳۱

۸۹؎ ایضاً ص ۱۳۲

۹۰؎ ایضاً ص ۱۳۳

۹۱؎ ایضاً ص ۱۳۴

۹۲؎ ایضاً ص ۱۳۸

۹۳؎ ایضاً ص ۱۴۰

۹۴؎ ایضاً ص ۱۴۵

۹۵؎ ایضاً ص ۱۴۶

۹۶؎ ایضاً ص ۱۴۹

۹۷؎ ایضاً ص ۱۵۰

۹۸؎ ایضاً ص ۱۵۱

۹۹؎ بحوالہ چمنستان مجموعہ کلام ظفر علی خاں ص۴۴ لاہور پبلشرز یونائیٹڈ ۱۹۴۴ء

۱۰۰؎ چمنستان ص ۴۸

۱۰۱؎ ایضاً ص ۱۵۵

۱۰۲؎ ایضاً ص ۱۵۶

۱۰۳؎ ایضاً ص ۱۶۰

۱۰۴ ایضاً ص ۱۶۰

۱۰۵ ایضاً ص ۱۶۱

۱۰۶ ایضاً ص ۱۶۶

۱۰۷ ایضاً ص ۱۶۸

۱۰۸ ایضاً ص ۱۶۹

۱۰۹ ایضاً ص ۱۷۱

۱۱۰ ایضاً ص ۱۷۲

۱۱۱ ایضاً ص ۱۷۹

۱۱۲ ایضاً ص ۱۸۱

۱۱۳ ایضاً ص ۱۸۲

۱۱۴ ایضاً ص ۱۸۴

۱۱۵ ایضاً ص ۱۸۵

۱۱۶ ایضاً ص ۱۸۷

۱۱۷ ایضاً ص ۱۸۸

۱۱۸ ایضاً ص ۱۸۹

۱۱۹ چمنستان ص۱۸۵

۱۲۰ روزنامچہ مولانا ظفر علی خان (غیر مطبوعہ) مورخہ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۶ء محولہ بالا ص ۱۹۹

۱۲۱ ایضاً ص ۲۰۰

۱۲۲ ایضاً ص ۲۰۳

۱۲۳ ایضاً ص ۲۰۷

۱۲۴ ایضاً ص ۲۰۹

۱۲۵ ایضاً ص ۲۱۰

۱۲۶ ایضاً جاے مذکور

۱۲۷ ایضاً ص ۲۱۳

۱۲۸۔ ایضاً ص ۲۱۵

۱۲۹۔ ایضاً ص ۲۱۵

۱۳۰۔ ایضاً ص ۲۱۸

۱۳۱۔ ایضاً ص ۲۱۸

۱۳۲۔ ایضاً ص ۲۲۳

۱۳۳۔ اخبار مدینہ بجنور ۱۷ر جولائی ۱۹۳۷ء میں اس تقریر کی رپورٹ شائع ہوئی لیکن ظفر علی خاں نے اس تقریر کی تردید کی اور لکھا کہ وہ مذکورہ جلسہ میں شریک نہیں تھے۔ چمنستان ص ۱۲۷

۱۳۴۔ چمنستان ص ۱۶۳

۱۳۵۔ ایضاً ص ۱۶۹

۱۳۶۔ ایضاً ص ۱۷۴

۱۳۷۔ ایضاً ص ۱۷۶

۱۳۸۔ ایضاً ص ۱۷۷

۱۳۹۔ ایضاً ص ۱۸۸

۱۴۰۔ ایضاً ص ۲۰۳

۱۴۱۔ ایضاً ص ۱۹۸

۱۴۲۔ ایضاً ص ۲۲۰

۱۴۳۔ ایضاً ص ۲۲۲

۱۴۴۔ ایضاً ص ۲۲۴

۱۴۵۔ حکیم آفتاب احمد قرشی کاروانِ شوق ص ۵۱۳ بحوالہ مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار محولہ بالا ص ۳۰۴

۱۴۶۔ چمنستان ص ۲۵۷

۱۴۷۔ ایضاً ص ۲۸۲

۱۴۸۔ ایضاً ص ۲۲۹

۱۴۹۔ ایضاً ص ۲۲۹

ایضاً ص ۲۳۱

۱۵۰۔ ایضاً ص ۲۳۲

۱۵۱۔ ایضاً ص ۲۳۶

۱۵۲۔ ایضاً ص ۲۳۷

۱۵۳۔ ایضاً ص ۲۳۷

۱۵۴۔ ایضاً ص ۲۳۷

۱۵۵۔ زاہد منیر عامر مکاتیبِ ظفر علی خان لاہور سنی پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء ص ۵۷

علامہ اسد اور پنجاب یونیورسٹی......وصل و فصل

تاریخِ اسلام میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جب کعبے کو صنم خانوں سے پاسباں مل گئے، ہماری ماضی قریب کی تاریخ میں علامہ محمد اسد بھی ایک ایسا ہی نام ہے جس نے ظلمت کدۂ یہود میں آنکھ کھولی، یہودی علوم اور عبرانی زبان پر دسترس حاصل کی لیکن اپنے باطن میں فروزاں تلاشِ حقیقت کی شمع کی روشنی میں سفر کرتا ہوا اسلام کے دامنِ امن و عافیت میں آپہنچا۔ اہلِ اسلام میں اسد کا شمول اُمتِ مسلمہ میں ایک فرد کا اضافہ ہی نہیں تھا بلکہ یہ واقعہ اسلام کی عالمگیر صداقت کا ایک مظہر بن کر اُبھرا۔ کتبِ یہود میں محمدِ عربیؐ کا ذکر موجود تھا اور بعثتِ نبویؐ کے وقت یہود، رحمت اللعالمینؐ کی آمد کے منتظر تھے جب محمدِ عربیؐ کی بعثت ہوئی تو بفحوائے ارشادِ ربانی یَعْرِفُوْنَہ' کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ [1] وہ پیغمبر آخرالزماںؐ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں لیکن وقتی سیاسی مفادات، قومی ضد اور نسلی تعصّب کے باعث انھوں نے آپؐ کی نبوت کا انکار کیا۔

اسد کے قبولِ اسلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کی کتب اپنے تبدیل شدہ متون کے باوصف فاران کی چوٹی سے اترنے والے کی، اب بھی، گواہی دیتی ہیں [۲] لیکن ان مطالب تک پہنچنے کے لیے طلبِ حق اور بے تعصبی کی ضرورت ہے جو اموال کی کثرت سے کورنگاہوں کو اکثر میسر نہیں۔

محمد اسد نے پولینڈ کے ایک یہودی گھرانے میں لمبرگ (موجودہ یوکرائن) میں ۲؍جولائی ۱۹۰۰ء کو آنکھ کھولی، ان کا خاندانی نام Leopold Weiss رکھا گیا۔ مذہبی صحائف اور عبرانی کی تعلیم کے بعد پہلی جنگِ عظیم کا طوفان انھیں آسٹریائی فوج میں لے گیا۔ فوجی زندگی کے تجربے نے زیادہ طول نہیں کھینچا اور وہ جلد اپنی تعلیم کی طرف لوٹ آئے، انھوں نے ویانا یونیورسٹی میں فلسفہ، تاریخ، آرٹ، طبیعیات اور کیمیا کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں پہلی بار مشرقِ وسطیٰ کا سفر اختیار کیا اور مصر، اُردن، فلسطین، شام اور ترکی کے اسفار کیے۔ ۱۹۲۴ء کے دوسرے سفر میں انھوں نے مصر، عمّان، شام، ٹریپولی، عراق، ایران، افغانستان، وسطِ ایشیا کی سیاحت کی۔ اپنے طویل تجربے اور مشاہدے اور مسلسل مطالعے کے بعد انھوں نے ۱۹۲۶ء میں، برلن میں، اسلام قبول کیا اور اپنا اسلامی نام محمد اسد رکھا۔ حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، قاہرہ میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے، وہ عالمی صحافت سے متعلق تھے اور اس حیثیت میں دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں ہندوستان آئے، یہاں ان کا قیام امرت سر، لاہور، سری نگر، دہلی اور حیدر آباد دکن میں رہا۔ وہ علامہ اقبال سے ملے، علامہ اقبال نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں نسلِ نو کو اسلامیات کا درس دیں، سید نذیر نیازی کے نام ۱۹۳۴ء کے متعدد خطوط میں اسد کے حوالے سے علامہ اقبال کا اظہارِ خیال موجود ہے [۳] اسی سال اُن کی کتاب

Islam at the Cross Road ؎ شائع ہوئی، جس کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا:

"This work is extremely interesting. I have no doubt that coming as it does from a highly cultured European convert to Islam it will prove an eye-opener to our younger generation." ؎

علامہ اقبال سے ملاقات کے بعد انھوں نے ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کو اپنا نصب العین بنالیا، اس کے بعد وہ اپنی تحریروں میں اسی نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں، انھوں نے اس آزاد مملکت کے لیے اسلامی دستور کے راہ نما اصول بھی مرتب کیے۔ ان کی انھی خدمات کے باعث انھیں Intellectual Co-founder of Pakistan بھی کہا گیا ہے ؎ قیامِ پاکستان، اسد کے خوابوں کی تعبیر تھا، اپنے خوابوں کی اس تعبیر کے بارے میں خود انھوں نے بھی ایک جگہ لکھا ہے:

For which I my self had worked and striven since 1933. ؎

۱۹۳۵ء میں انھوں نے صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے اور تشریح کی اشاعت کا کام شروع کیا اور اس کے پانچ اجزا شائع کیے۔ ؎ جنوری ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد دکن سے نکلنے والے رسالے *Islamic Culture* کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۳۸ء تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء ۔۔۔۔۔۱۴؍ اگست ۱۹۴۵ء) میں برطانوی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا۔ طویل عرصے تک صعوبتیں جھیلنے اور صدمے اٹھانے کے بعد رہا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں ایک ماہانہ رسالے عرفات کا اجرا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے موقع پر ڈلہوزی سے لاہور آگئے اور ماڈل ٹاؤن میں مقیم ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد انھیں اسلامی تعمیرِ نو کے ایک نئے محکمے Department of

Islamic Reconstruction کا ڈائریکٹر بنایا گیا، انھوں نے وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری اور مڈل ایسٹ ڈویژن کے انچارج کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں حکومتِ پاکستان کے نمائندے کے طور پر سعودی عرب گئے، اگلے برس انھیں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا جہاں انھوں نے Committe on Information from Non-Self Govt. Territories کے چیئرمین اور Disarmament Commission of the Security Council کے رُکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۴ء میں اُن کی مشہور کتاب The Road to Mecca شائع ہوئی۔ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی سفارت سے مستعفی ہونے کے بعد انھوں نے سوئٹزرلینڈ، بیروت، شارجہ اور لبنان کے اسفار کیے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی کتاب The Principals of State and Govt. in Islam شائع ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے مراکو میں رہائش اختیار کر لی جہاں وہ ۱۹۸۱ء تک مقیم رہے۔ ۱۹۸۰ء میں قرآنِ حکیم کے ترجمے اور تشریحات پر مبنی ان کی کتاب The Message of Quran شائع ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے نفاذِ اسلام کے سلسلے میں راہ نمائی لینے کے لیے ایک بار پھر انھیں پاکستان بلایا اور انھوں نے انصاری کمیشن کے اجلاس میں شرکت کی۔

حصولِ آزادی کے بعد وہ پہلے شخص تھے جنھیں پاکستانی پاسپورٹ جاری کیا گیا تھا۔ پہلے پاکستانی پاسپورٹ کے حامل اس محبِ وطن کا یہ آخری سفرِ پاکستان ثابت ہوا۔ وہ پاکستان سے ۳/اگست ۱۹۸۳ء کو لندن چلے گئے تھے جہاں سے انھوں نے پرتگال کا سفر اختیار کیا۔ ۱۹۸۷ء میں وہ مراجعت فرمائے ہسپانیہ ہوئے (اسی سال ان کی آخری کتاب

This Law of Ours and Other Essays [12] شائع ہوئی) اور یہیں ۲۰ر فروری ۱۹۹۲ء کو انھوں نے زندگی کی آخری سانس لی، اب وہ غرناطہ کے مسلم قبرستان میں آرام فرما ہیں۔

جیسا کہ سطورِ ماقبل سے ظاہر ہے، عالمی سطح کے ایک نام ور دانش اور علوم اسلامی کے ایک ماہر کی حیثیت سے وطنِ عزیز نے اُن کی خدمات سے استفادہ کیا۔ ملک کی قدیم ترین اور بزرگ ترین جامعہ؛ پنجاب یونیورسٹی نے بھی علامہ اسد کے علم وفضل سے استفادے کی راہیں کشادہ کیں۔ علامہ اسد پر اب تک جو تحقیقی کام سامنے آچکا ہے اس میں پنجاب یونیورسٹی اور علامہ اسد کے حوالے سے معلومات کا فقدان ہے۔ علامہ اسد کی پہلی سوانح [13] (Leopold Weiss alias Muhammad Asad) جرمن زبان میں لکھی گئی اس میں پنجاب یونیورسٹی بلکہ پاکستان ہی کا کوئی تذکرہ ممکن نہیں تھا اس لیے کہ یہ کتاب ۱۹۲۷ء تک کے احوال سے بحث کرتی ہے، اس کے بعد حال ہی میں The Truth Society کی طرف سے علامہ اسد کے احوال وآثار اور ان کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین، دو ضخیم مجلّدات کی صورت میں شائع ہوئے ہیں [14] ایک ہزار سے زائد صفحات کے اس مجموعے میں بھی جہاں علامہ اسد کی زندگی کے بیشتر پہلو زیر بحث آگئے ہیں، اقبال اور اسد، اسد اور خیری برادران وغیرہ جیسے ارتباطی موضوعات پر بھی کلام کیا گیا ہے لیکن علامہ اسد کی زندگی کے اس ورق سے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، علامہ اسد کے افکار کے حوالے سے پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا ایک مقالہ بھی تحریر کیا جا چکا ہے [15] اس کے اوراق بھی Europe's gift to Islam کی طرح اسلامک کلوکیم میں علامہ اسد کے تقرر کے مختصر تذکرے کے سوا علامہ اسد اور پنجاب یونیورسٹی کے حوالے سے

خاموش ہیں۔

ذیل کے مضمون میں ہم پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ علامہ اسد کے ربط و تعلق کے تین مظاہر پر بات کریں گے جن میں سے اوّل الذکر دو پہلو ایسے ہیں جو اس مضمون کے ذریعے پہلی بار واضح کیے جا رہے ہیں۔

پہلی بار اس ضمن میں علامہ مرحوم کے اپنے خطوط اور پنجاب یونیورسٹی کے اعلیٰ اداروں کی رودادوں سے مدد لی گئی ہے۔ اس مضمون میں پیش کیے جانے والے علامہ اسد کے تمام خطوط غیر مطبوعہ ہیں اور ان سطور کے ساتھ پہلی بار اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔

﴿1﴾

قیامِ پاکستان کے بعد نئے ملک کی اسلامی شناخت کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ان میں ایک، ملک کی قدیم ترین اور بزرگ ترین جامعہ، پنجاب یونیورسٹی میں علوم اسلامی کے شعبے کا قیام بھی شامل تھا۔ پنجاب یونیورسٹی نے یونیورسٹی کی ایک وحدت کے طور پر ۱۸۸۲ء میں آغاز کیا تھا لیکن ہنوز اس میں علومِ اسلامی کا کوئی شعبہ موجود نہیں تھا، اس حقیقت اور نئے وطن کے تقاضوں کے پیشِ نظر پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے اپنے اجلاس ۵ رفروری ۱۹۴۹ء میں یہ فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی میں اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کیا جائے [۱۶]۔ جامعات میں جب نئے شعبے قائم کیے جاتے ہیں تو ان میں تدریس اور سربراہی کے لیے اُس مضمون کی رسمی سند رکھنے والے تو مہیا نہیں ہوتے البتہ ان مقاصد کے لیے ایسے علما کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اُس شعبۂ علم میں درجۂ کمال پر فائز ہوں۔ علامہ محمد اسد ۱۹۲۶ء میں قبولِ اسلام کے بعد علومِ اسلامی سے سنجیدگی کے ساتھ وابستہ رہے۔ اور انھوں نے اتنا کمال بہم پہنچایا کہ جب پنجاب یونیورسٹی نے علومِ اسلامی کا شعبہ قائم کرنے

کا فیصلہ کیا تو اس کی مسندِ صدارت کے لیے حکام کی نگاہِ انتخاب علامہ محمد اسد پر جا کر رُکی۔ پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے جس اجلاس (۵ر فروری ۱۹۴۹ء) کا ابھی ذکر ہوا اُس میں وائس چانسلر نے شعبہء اسلامیات کی صدارت کے لیے علامہ اسد کا نام تجویز کیا اُس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک تھے جو اس منصب پر ستمبر ۱۹۴۷ء سے ستمبر ۱۹۵۰ء تک فائز رہے۔ یونیورسٹی نے ایک خط کے ذریعے علامہ اسد کو اس پیش کش سے مطلع کیا۔ یہ اطلاع رجسٹرار کیپٹن محمد بشیر کی طرف سے مراسلہ نمبر ۱۲۴۳ ر جی ایم مورخہ ۸ر فروری ۱۹۴۹ء کو دی گئی۔ رجسٹرار کی طرف سے بھیجے جانے والے خط کا متن درجِ ذیل ہے:

To

Allama M. Asad

Director Department of Islamic Reconstuction, West Punjab, Lahore.

Sir,

I have the honour to inform you that the Syndicate has appointed you as an honorary head of the department of the Islamiyyat of this University. Kindly ackowledge.

I have etc. etc.

Signatured

Deputy Registrar (Admin).

for Registrar

یہ مراسلہ ملنے پر علامہ اسد نے اس پیش کش کو قبول کر لیا جس کا اظہار ان کے ایک خط سے ہوا جس میں انھوں نے یونیورسٹی رجسٹرار کے منقولہ خط کی رسید دیتے ہوئے یونیورسٹی کا شکریہ ادا کیا۔ علامہ اسد کا یہ خط ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کو لکھا گیا، خط کا متن درجِ ذیل ہے:

(2)

UNIVERSITY OF THE PANJAB.

No. 1243/41

Senate Hall, The 2/2/ 194?

All communications with this office should be addressed to THE REGISTRAR, University of the Panjab, LAHORE.

From
Captain M. BASHIR, B.Sc, HONS. (EDIN),
Registrar, University of the Panjab,
LAHORE.

To
Allama M. Asad,
Director Department of Islamic
Re-construction, West Punjab,
Lahore.

Sir,
I have the honour to inform you that the Syndicate has appointed you as an honorary Head of the Department of Islamiyyat of this University.

Kindly acknowledge.

I have etc. etc.

7/2/49

Deputy Registrar(Admn.),
for Registrar.

7/2

رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے، علامہ اسد کو شعبۂ اسلامیات کا پہلا صدر بنائے جانے کا اطلاع نامہ

February 12, 1949

Captain M. Bashir, B.Sc. Hons. (Edin)

Registrar, University of the Punjab,

Lahore.

I thank you for your letter No. 1243/LM dated the 3rd February, 1949, informing me that the Syndicate has appointed me as honorary Head of the Department of Islamiyyat of the University, for which honour I am grateful.

Yours truly,

Signatured

(M. ASAD)

یونیورسٹی میں سنڈیکیٹ کے فیصلوں کی توثیق سینیٹ کا ادارہ کیا کرتا ہے، علامہ اسد کے اعزازی صدرِ شعبہء اسلامیات مقرر کیے جانے کا فیصلہ سینیٹ کے اجلاس منعقدہ ۲۹/مارچ ۱۹۴۹ء میں پیش کیا گیا۔ سینیٹ نے جس کی توثیق کردی۔ سینیٹ کے مذکورہ اجلاس کی روداد میں درج ہے:

The Senate at its meeting held on 29th March, 1949, has approved the following items:-

15. That the recommendations of the Syndicate relating to the appointment of the following persons in the various University Teaching Departments be approved (Vide paragraphs 16 and 2, 3, 32 and 38 of the Syndicate Proceedings, dated the 5th and 11th February, 1949, respectively):-

1. Allama Muhammad Asad, as Honorary Head of the

GOVERNMENT OF WEST PUNJAB

DEPARTMENT OF ISLAMIC RECONSTRUCTION

OFFICE OF THE DIRECTOR

LAHORE, February 12, 1949

Captain M. Bashir, B.Sc., Hons. (Edin),
Registrar, University of the Punjab,
LAHORE.

Dear Sir,

I thank you for your letter No.1343/LM dated the 3rd February, 1949, informing me that the Syndicate has appointed me as honorary Head of the Department of Islamiyyat of the University, for which honour I am grateful.

Yours truly,

(M. ASAD)

Despatcher
Calendar clerk
to note pl.

Please call a meeting of the Board as early as possible.

Steps to call a meeting are being made. This may be filed with the Asstt. Syndicate please.

پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبہ اسلامیات مقرر کیے جانے پر علامہ اسد کی طرف سے شکریے کا خط

Department of Islamiyat.

Copy of the above forwarded for information and necessary action to the A.R.A. and D.R.A./H.A.A./Asstt.Misc/Mr. Hassan Din with files to inform the persons concerned and Head of the Teaching Departments. [۱۷]

اس تقرر پر گیارہ ماہ گزرنے کے بعد علامہ اسد نے استعفیٰ پیش کر دیا، انھوں نے وائس چانسلر کے نام اپنے خط میں استعفیٰ کا سبب اپنی مصروفیات کو بتایا اور کہا کہ میں ان مصروفیات کی موجودگی میں اعزازی صدرِ شعبہء اسلامیات کے فرائض سے انصاف نہیں کر سکتا اس لیے فوری طور پر میرا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔ علامہ اسد کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ آیا وائس چانسلر لاہور میں موجود ہیں یا نہیں چنانچہ انھوں نے استعفیٰ کا خط ایک سر پوش مراسلے کے ساتھ رجسٹرار کو بھجوایا اور اپنے سر پوش مراسلے میں یہ لکھا کہ شعبہ اسلامیات سے متعلق میرے پاس جو فائلیں ہیں وہ بھی ڈپٹی رجسٹرار ایڈمن کو واپس کی جا رہی ہیں، رجسٹرار کیپٹن محمد بشیر کے نام علامہ اسد کے خط کا متن درجِ ذیل ہے:

3. Chamba House Lane.

Lahore, January 24, 1950.

My dear Capt. Bashir,

As I am not sure whether the Vice-Chancellor is at present in Lahore. I am sending my resignation from the post of Honorary Head of the Deptt. of Islamiyyat to you, with the request to place it before him at the earliest opportunity. The files in my possession relating to this Department are being returned to the Deputy Registrar (Adm.).

Thanking you,

Yours sincerely,

693 PR
26/1

237 APS
26.1.50

3, Chamba House Lane,
Lahore, January 24, 1950.

(8)

My dear Capt. Bashir,

As I am not sure whether the Vice-Chancellor is at present in Lahore, I am sending my resignation from the post of Honorary Head of the Deptt. of Islamiyat to you, with the request to place it before him at the earliest opportunity. The files in my possession relating to this Department are being returned to the Deputy Registrar (Adm.).

Thanking you,

Yours sincerely,

M. Asad.

Capt. M. Bashir, M.Sc. (Edin),
Registrar,
University of the Punjab,
LAHORE.

The resignation has already been passed on to the V.C. separately.
26/1

صدرِ شعبہ اسلامیات کے منصب سے مستعفی ہوتے ہوئے استعفیٰ کے ساتھ رجسٹرار کو بھجوایا گیا سرپوش مراسلہ

Signatured

Capt. M. Bashir, M.Sc.(Edin),

Registrar

University of the Punjab,

LAHORE.

اس سرپوش مراسلے کے ساتھ بھیجے جانے والے استعفیٰ پرمبنی وائس چانسلر کے نام علامہ اسد کا خط درج ذیل ہے:

3, Chamba House Lane,
Lahore, January 24, 1950.

The Vice-Chancellor,

Punjab University , Lahore.

Dear Sir,

Owing to my pre-occupations I am not in a position to do justice to my office as Honorary Head of the Department of Islamiyyat, Punjab University, and request you therefore kindly to accept my resignation from this office with immediate effects.

Yours truly,
Signatured
(M. ASAD)

یہ استعفیٰ وائس چانسلر صاحب کے ملاحظہ میں لایا گیا اور انھوں نے ۲۵ رجنوری ۱۹۵۰ء کو اس پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اور اسے سنڈیکیٹ کی اطلاع کے لیے بھجوا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے ذیل کا دفتری نوٹ تیار کیا گیا:

Office Note

Subject: **Resignation of Allama Mohammad Asad as Hororary**

5, Shamsa House Lane,
Lahore, January 26, 1950.

The Vice-Chancellor,

Punjab University,

<u>Lahore.</u>

Dear Sir,

Owing to my pre-occupations I am not in a position to do justice to my office as Honorary dean of the Department of Islamiyyat, Punjab University, and request you therefore kindly to accept my resignation from this office with immediate effect.

Yours truly,

M. Asad

(M. ASAD)

شعبۂ اسلامیات کی صدارت سے علامہ اسد کا استعفیٰ

Head of the Department of Islamiyyat.

At the time of creation of Islamiyyat as a subject for various University Examinations, Allama M. Asad was appointed as Honorary Head of the Department of Islamiyyat. The Allama has tendered his resignation on the grounds that owing to his pre-occupations he is not in a position to do justice to his office, and requests that his resignation be accepted with immediate effect.

The Syndicate may accept his resignation and appoint a substitute in his place.

حسبِ ضابطہ یہ استعفیٰ سنڈیکیٹ کے اجلاس میں پیش کیا گیا جس کی منظوری کے بعد معاملہ سینیٹ میں لے جایا گیا۔ سینیٹ کے اجلاس منعقدہ ۳۰/مارچ ۱۹۵۰ء کی رُوداد مظہر ہے کہ سینیٹ نے علامہ اسد کے استعفیٰ سے متعلق سنڈیکیٹ کی سفارش کی توثیق کردی۔ سینیٹ کی روداد میں لکھا گیا ہے:

That the recommendations of the Syndicate relating to the acceptance of the resignation of the following person be approved (vide paragraph 7 and 15, 17 and 20 of the Syndicate proceedings dated 6th February 1950 and 7th March 1950 respectively)

. 4. Allama Muhammad Asad, as honorary head of the department of Islamiyyat. ۱۸

علامہ اسد کے استعفیٰ کے بعد یونیورسٹی نے صدرِ شعبہ اسلامیات کا منصب علامہ علاء الدین صدیقی (۳/نومبر ۱۹۰۷ء...... ۲۷/دسمبر ۱۹۷۷ء) کو پیش کیا، علامہ صاحب موصوف نے یہ منصب قبول کیا یوں وہ پنجاب یونیورسٹی شعبہ اسلامیات کے دوسرے سربراہ قرار پائے (بعض اصحاب نے انھیں پہلا سربراہ ۱۹ قرار دیا ہے) سنڈیکیٹ کے اجلاس

منعقدہ ۷؍مارچ ۱۹۵۰ء میں علامہ اسد کا استعفیٰ منظوری کے لیے پیش کیا گیا، اسی اجلاس میں اعزازی صدر شعبہ اسلامیات کے طور پر علامہ علاء الدین صدیقی کا تقرر کردیا گیا۔ یہ تقرر مستقل انتظام ہوجانے تک کے لیے ۵۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر یکم جولائی ۱۹۵۰ء سے کیا گیا [۲۰] اور اس تقرر کی اطلاع انھیں ۲۷؍مارچ ۱۹۵۰ء کو اسسٹنٹ رجسٹرار جنرل نے ایک مراسلے کے ذریعے دی۔ گزشتہ صفحات میں پیش کیے جانے والے شواہد کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے اوّلین سربراہ علامہ اسد تھے جو اس منصب پر گیارہ ماہ تک فائز رہے۔ شعبے کا قیام اور اس کے ابتدائی مراحل انھی کے دور میں طے پائے جیسا کہ ان کے استعفیٰ میں شعبے کے ریکارڈز کی واپسی کا اشارہ ظاہر کررہا ہے۔ [۲۱]

شعبہ اسلامیات کی صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد بظاہر پنجاب یونیورسٹی سے علامہ اسد کا تعلق ختم ہوگیا، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یونیورسٹی اس کے بعد بھی اس امر کی مشتاق رہی کہ علامہ اسد کسی طرح اس سے وابستہ ہوجائیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک (۱۸۹۲ء......۱۹۸۲ء) بھی علامہ اسد کے ایک قدردان اور مداح تھے، وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور جون ۱۹۵۰ء تک اس منصب پر خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے اسلامی آئین کے خط وخال واضح کرنے کے لیے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خان کے ساتھ مل کر ۵،۶۔۷ مارچ ۱۹۵۰ء کو آل پاکستان پولیٹیکل سائنس کانفرنس مقرر کروائی، اس کانفرنس کا پہلا اجلاس مسلم نظریۂ سیاست وحکمرانی کے موضوع پر ہوا، اس اجلاس کی صدارت

علامہ اسد کو تفویض کی گئی ۲۲ اس واقعہ کے بعد کم از کم دوبار علامہ اسد کا پنجاب یونیورسٹی سے انسلاک ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں السنہء شرقیہ کے ساتھ جرمن اور فرانسیسی زبانوں کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، قیامِ پاکستان کے بعد ان میں ہسپانوی اور روسی زبانوں کی تدریس کا بھی اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ ترکی اور جاپانی کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، یہاں تک کہ چیف جسٹس عبدالرشید کی قیادت میں قائم ہونے والے آٹھ رکنی پنجاب یونیورسٹی کمیشن نے یہاں ایک لینگوئج یونٹ قائم کرنے اور اس ادارے کو کالج آف اورینٹل اینڈ ویسٹرن لینگوئجز بنانے کی سفارش کی ۲۳ آزادی کے بعد ڈاکٹر برکت علی قریشی یہاں جرمن زبان کی تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے، ڈاکٹر قریشی بنیادی طور پر پروفیسر عربی کے منصب پر فائز تھے وہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں اورینٹل کالج سے منسلک ہوئے اور مئی ۱۹۴۸ء میں پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے انتقال کے بعد پرنسپل اورینٹل کالج مقرر ہوئے۔ فروری ۱۹۵۰ء میں انھیں سفیر بنا دیا گیا، انھوں نے سفیرِ پاکستان کی حیثیت سے شام، لبنان اور اُردن میں سفارتی خدمات انجام دیں ۲۴ اور جون ۱۹۵۱ء میں اپنے پرانے مناصب پر یعنی پروفیسر عربی اور پرنسپل اورینٹل کالج کی حیثیت سے واپس آگئے۔ ڈاکٹر قریشی نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی انھوں نے ۱۹۲۸ء میں برلن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی وہ جرمن زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے لہٰذا اورینٹل کالج میں جرمن زبان کی تدریس کا فریضہ بھی وہی انجام دیتے تھے۔ فروری ۱۹۵۰ء میں ان کے سفیر بن کر چلے جانے پر اس تدریسی سلسلے میں خلل واقع ہوا۔ انھوں نے تدریسِ زبان کے کورس کا آغاز ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو کیا تھا، ابتدائی درجے کی اس کلاس میں بیس طالب علم

شریک تھے۔ یکم فروری ۱۹۵۰ء کو جب کہ ابھی اس سلسلے پر تین ماہ بھی پورے نہیں ہوئے تھے وہ رُخصت پر چلے گئے، اگرچہ ابھی شعبہء اسلامیات کی صدارت سے علامہ اسد کے استعفیٰ کے واقعہ کو محض دو ماہ گزرے تھے، یونیورسٹی نے جرمن کورس کے تدریسی سلسلے کو بحال رکھنے کے لیے علامہ اسد کو دعوت دی۔ علامہ اسد عربی، فارسی، فرانسیسی، پرتگالی، ہسپانوی، اُردو میں یکساں مہارت رکھتے تھے ۲۵؎ انگریزی، جرمن اور ڈچ، عبرانی پر اُن کی گرفت مسلمہ تھی چنانچہ اُن سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ پیر، منگل، بدھ اور جمعرات کو جرمن زبان پر چار لیکچر دے دیا کریں۔ اس خدمت کے عوض انھیں دو سو روپے ماہوار معاوضے کی پیش کش کی گئی۔

پیش کش کا خط رجسٹرار کی طرف سے ڈپٹی رجسٹرار ایڈمن نے ارسال کیا۔ خط میں لکھا گیا:

Senate Hall,
March 20, 1950.

Allama M. Asad,
3 - Chamba House Lane,
Golf Road, Lahore.

Sir,

I have been directed by the Vice-Chancellor to enquire if you would be willing to take German Classes. At the present moment there is only one elementary class consisting of 20 students. The Course was started by Principal B.A. Kuraishi on the 17th October, 1949 and no instruction has been imparted after the 1st February, 1950. The lecturer would be expected to take four periods a week i.e. on Monday, Tuesday, Wednesday and Thursday. The recommendation offered by the University is Rs. 200/- p.m.

OFFICE NOTE

Subject — Resignation of Allama Mohammad Asad as Honorary Head of the Department of Islamiyyat.

+.+.+.+.+.+.+.+

At the time of creation of Islamiyyat as a subject for various University Examinations, Allama M. Asad was appointed as Honorary Head of the Department of Islamiyyat. The Allama has ~~handed~~ tendered his resignation on the grounds that owing to his pre-occupations he is not in a position to do justice to his office, and requests that his resignation be accepted with immediate effect.

The Syndicate may accept his resignation and appoint a subbstitute in his place.

+.+.+.+.+.+.+.+

علامہ اسد کے استعفیٰ کے حوالے سے سنڈیکیٹ میں پیش کیا گیا آفس نوٹ

An early reply is requested.

I have etc.,

Signatured
Deputy Registrar (Admn.),
for Registrar.

یوں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اسد نے اس پیش کش پر سنجیدگی سے غور کیا، انھیں یہ خط ملا تو وہ کراچی کے لیے عازم تھے چنانچہ انھوں نے کوئی حتمی جواب دینے کی بجائے خط کی رسید دینے پر اکتفا کیا اور لکھا کہ کراچی سے واپسی پر وہ اس پیش کش کا بہتر جواب دے سکیں گے۔ اور یہ توقع بھی ظاہر کی کہ ہوسکتا ہے کراچی میں ان کی ملاقات وائس چانسلر صاحب (جو اس وقت ڈاکٹر عمر حیات ملک تھے) سے بھی ہو جائے اور ایسا ہونے کی صورت میں وہ وائس چانسلر صاحب سے بھی اس مسئلے پر تبادلہ ٔخیال کریں گے۔ رجسٹرار کے نام علامہ اسد کا یہ خط ۲۲ / مارچ ۱۹۵۰ء کو چنبہ ہاؤس لاہور سے لکھا گیا، خط کا متن:

Chamba House Lane,
Lahore, March 22, 1950.

Deputy Registrar (Adm.),
Punjab University,
Lahore.

Dear Sir,

With reference to your letter No. 1064/G, dated the 20th instant, I have to inform you that I am leaving for Karachi tomorrow morning, and cannot, therefore, give you a final reply regarding the matter under consideration. I shall be, however, back

in Lahore within a week or so, and shall contact you then. In Karachi I hope also to meet the Vice-Chancellor and to discuss the matter with him as well.

Yours truly,

Signatured

(M.ASAD)

کراچی سے واپسی کے بعد علامہ اسد نے کیا جواب دیا، آیا کراچی میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی سے ان کی ملاقات ہوئی یا نہیں اس کا کچھ علم نہیں، تاہم بعدازاں جرمن زبان کی تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ اگلے ہی برس ڈاکٹر برکت علی قریشی واپس آ گئے جنھوں نے اپنی سبکدوشی (۱۹۵۴ء) تک فرائضِ تدریس انجام دیے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر بشارت علی (۱۹۵۴ء......۱۹۵۵ء) ڈاکٹر براؤن (۱۹۵۵ء......۱۹۶۰ء) ڈاکٹر پیٹر شونگل (۱۹۶۰ء......۱۹۶۱ء) اور مسز ارسلا جیفتکی [۲۶] اس شعبے میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

﴿3﴾

پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ علامہ اسد کا آخری ربط انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے حوالے سے ہوا۔ یہ کلوکیم قیامِ پاکستان کے بعد یونیورسٹی کی پہلی بین الاقوامی سرگرمی تھی۔ اس کی تحریک امریکہ میں پاکستان کے سفیر سید امجد علی نے کی تھی، جو اُس وقت مرکزی وزیرخزانہ تھے اس کلوکیم کے اخراجات حکومتِ پاکستان نے برداشت کیے اور اس کے لیے پہلے پچاس ہزار روپے اور پھر تین لاکھ روپے کی گرانٹ دی گئی [۲۷] اس علمی مجلسِ مذاکرہ میں مسلم دنیا کے چالیس ملکوں سے علما اور دانش وروں نے شرکت کی اور مذہب اور ثقافت

کے موضوعات پر مقالات پیش کیے۔ یہ اپنی نوعیت کا دوسرا انٹرنیشنل کلوکیم تھا، پہلا کلوکیم لائبریری آف کانگریس اور پرنسٹن یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس دوسرے کلوکیم کے لیے وطنِ عزیز کی چھ جامعات کے نمائندوں پر مشتمل ایک کلوکیم کمیٹی قائم کی گئی تھی جس میں مختلف حلقوں سے تجاویز طلب کرنے کے بعد کلوکیم کے لیے بہ تفصیلِ ذیل نو موضوعاتِ بحث تجویز کیے۔

۱۔ اسلامی ثقافت اور اس کا مفہوم ۲۔ اسلام کا تصورِ ریاست ۳۔ مسلم معاشروں کے لیے جدید تصورات اور سماجی اقدار کا چیلنج ۴۔ اجتہاد کا کردار اور اسلام میں قانون سازی کے امکانات ۵۔ سائنس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر ۶۔ مغربی تاریخ اور ثقافت پر اسلام کے اثرات ۷۔ اسلام کے سماجی ڈھانچے میں معاشیات ۸۔ دوسرے ادیان کے بارے میں اسلام کا رویہ اور روابط ۹۔ عالمی امن کے قیام میں اسلام کا کردار [۲۸]

اس نہایت اہم کلوکیم کے انتظامات کے لیے علامہ اسد کو دعوت دی گئی، جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ پنجاب یونیورسٹی چانسلرز کمیٹی کی رُوداد مظہر ہے کہ علامہ اسد نے یکم مارچ ۱۹۵۷ء کو کلوکیم کے ڈائریکٹر کا منصب سنبھالا، اس منصب کے لیے ذیل کی شرائط طے کی گئی تھیں:

(A) He would be paid a consolitated sum of Rs. 2500 p.m for the period he would act as Director.

(B) He would be entitled to get return passage from Bandoum to Lahore in respect of himself and his wife. [۲۹]

بعد ازاں انھیں ایک صدرِ شعبہ جتنے مالی اختیارات بھی دے دیے گئے، چانسلرز کمیٹی کے اجلاس ۳۰ مارچ ۱۹۵۷ء کی رُوداد میں درج ہے:

The honorary treasurer had recommended that Mr. Muhammad Asad who had been appointed Project Officer of the International Islamic Colloquium be deligated the same financial power as were exercised by Heads of the University Departments. ۳۰

علامہ اسد نے وائس چانسلر سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اُن کی اہلیہ پولا حمیدہ کو اُن کی سیکریٹری کے طور پر کام کرنے کی اجازت دی جائے چنانچہ وائس چانسلر کی سفارش پر چانسلرز کمیٹی نے اپنے ۲۰ را پریل ۱۹۵۷ء کے اجلاس میں مندرجہ ذیل امور منظور کیے:

(2) Mr. Muhammad Asad the Project Officer be designated as Director of Colloquium.

(3) Mrs. Pola Hamida Asad's offer to act as Secretary in an honorary capacity be accepted with thanks. ۳۱

علامہ اسد کو اس کلوکیم کے انتظامات کے لیے بیروت سے بلوایا گیا تھا انھیں اپنے اسباب کی بیروت سے کراچی اور کراچی سے لاہور منتقلی کے لیے رقم کی ضرورت تھی چنانچہ انھوں نے یونیورسٹی سے درخواست کی کہ اس مقصد کے لیے ایک ہزار روپے پیشگی دے دیے جائیں، جنھیں وہ بعدازاں بالاقساط ادا کر دیں گے۔ وائس چانسلر نے چانسلرز کمیٹی کے اجلاس سے پہلے سپیشل کیس کے طور پر اس رقم کی پیشگی منظوری دے دی، طے یہ کیا گیا کہ اس رقم کی واپسی دوسو روپے ماہوار اقساط کے ذریعے سے کی جائے گی۔ اقامتی افسر محاسبہ (Resident Auditor) نے چانسلرز کمیٹی کے اجلاس میں یہ موقف اختیار کیا کہ رقم کی واپسی تین اقساط میں ہو جانی چاہیے، بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ وائس چانسلر کے اقدام کی توثیق کر دی جائے تاہم اگر علامہ اسد کا کام اقساط پوری ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا ہے تو بقیہ رقم اُن کی آخری تنخواہ سے منہا کر لی جائے گی۔ چانسلرز کمیٹی کی روداد کا اقتباس

درجِ ذیل ہے:

Audit objection in regard to the number of installments for recovering the amount advanced to Mr. M. Asad for transportation of his house-hold belongings.

Mr. M. Asad, Director, International Islamic Colloquium, had requested for an advance of one month's salary to enable him to meet expenses in connection with the shipment and transportation charges of his household belongings from Beirut to Karachi, and Karachi to Lahore. The Vice-Chancellor, in anticipation of the approval of the Chancellor's Committee, sanctioned the advance as a special case. The recovery of the amount was to be made at the rate of Rs. 200 per mensum. The Resident Senior Auditor while allowing the payment to be made provisionally desired that the sanction of the Chancellor's Committee should be obtained and that the recovery be made in three installments.

After discussion, resolved to confirm the action taken by the Vice-Chancellor and to permit Mr. Asad to repay the loan at the rate of Rs. 200 per mensum and in case his assignment ended prior to the adjustment of the amount the entire balance to recovered from his last month's pay. ؂۳۲

ان شرائط و معاملات کے بعد علامہ اسد نے پوری توجہ اور محنت کے ساتھ اسلامک کلوکیم کے لیے کام شروع کیا۔ پاکستان ایک نیا ملک تھا اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پہلی بار عالمی سطح کے دانش وروں کو بلایا جا رہا تھا۔ علامہ اسد نے اپنے روابط کے ذریعے ”مختلف ملکوں کے علما سے رابطہ قائم کر کے ان سے اس علمی اجتماع کے لیے مقالات

لکھوائے اور انھیں کلوکیم میں شرکت پر آمادہ کیا'' صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب کے مطابق ''اسلامک کلوکیم کی تاریخ میں علامہ محمد اسد کا کردار مرکزی تھا'' ۳۳؎ لیکن افسوس کہ کلوکیم کے انتظامات کرنے کے بعد علامہ اسد کو اس سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ان کے بعد کلوکیم کے ڈائریکٹر کا منصب ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے حصے میں آیا جب کہ جوائنٹ ڈائریکٹرز کے طور پر علامہ علاء الدین صدیقی (صدر شعبۂ اسلامیات) اور کیپٹن محمد بشیر (رجسٹرار) کا تقرر کیا گیا۔ سیکریٹری کے طور پر شیخ امتیاز علی (پرنسپل یونیورسٹی لا کالج) اور محمد افضل (سیکریٹری سیکنڈری بورڈ) مقرر ہوئے۔

کلوکیم سے علامہ اسد کی علیحدگی کے بارے میں دو مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک رائے کے مطابق علامہ اسد کو یونیورسٹی سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں، دوسرے موقف کے مطابق علامہ اسد سے وائس چانسلر صاحب کے اختلافات اس کا سبب بنے۔ پہلے موقف کا اظہار رسالہ ترجمان القرآن کے ایک اداریے سے ہوتا ہے جو کلوکیم کے انعقاد کے بعد لکھا گیا جس میں کلوکیم کے حوالے سے تفصیل سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا گیا:

> ''......ان تراجم کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ محمد اسد صاحب کی شکایات بالکل بجا تھیں اور یہ لوگ اس معیار کو قائم نہیں رکھ سکے جس کی مجلس مذاکرہ متقاضی تھی اور جس کی یقین دہانی اسد صاحب کا استعفیٰ قبول کرتے وقت بار بار کرائی گئی تھی.........'' ۳۴؎

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اسد کا اختلاف انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے مقالات کی اشاعت سے متعلق تھا اور بعض روایات کے مطابق ان کا خیال تھا کہ عربی

مقالات کے انگریزی تراجم اور انگریزی مقالات کے عربی تراجم شائع کیے جائیں، جیسا کہ علامہ اسد کے شخصیت نگار محمد ارشد نے لکھا ہے: ''علامہ اسد انگریزی زبان میں پیش کیے جانے والے مقالات کا عربی واُردو جب کہ عربی زبان کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجمین کی خدمات حاصل کرنے میں شیخ الجامعہ سے اختلافات کے سبب اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔'' ۳۵

لیکن رسالہ ترجمان القرآن کے محولہ اقتباس کا دوسرا حصہ پھر بھی واضح نہیں ہوتا جس میں کہا گیا ہے کہ ''جس (معیار) کی یقین دہانی اسد صاحب کا استعفیٰ قبول کرتے وقت بار بار کرائی گئی تھی ......'' اس جملے سے بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے یقین دہانی کروائی تھی ......؟ اور کس کو کروائی گئی تھی ......؟ اسد صاحب اختلافات کے باعث مستعفی ہو رہے تھے تو ایسے میں انھیں کیا یقین دہانی کروائی جاسکتی تھی ......؟ ایک موقف یہ ہے کہ وائس چانسلر صاحب کلوکیم کے انتظامات کی جانب سے فکر مند تھے اور کلوکیم کے انعقاد میں ایک ماہ رہ گیا تھا جب انھوں نے علامہ اسد کو بلا کر باز پُرس کی جس نے تلخ صورت اختیار کرلی اور علامہ اسد فوری طور پر مستعفی ہوگئے۔ راقم الحروف نے شیخ امتیاز علی صاحب سے علامہ اسد کے استعفیٰ کی وجوہ دریافت کیں تو انھوں نے بتایا کہ دنیا بھر سے سکالرز کو بلایا گیا تھا، لاہور میں اچھے معیار کا ایک ہی ہوٹل (فلیٹیز) تھا، انتظامیہ پر مہمانوں کے قیام اور سیکورٹی کے مسائل کا دباؤ تھا، وائس چانسلر اس حوالے سے فکر مند تھے۔ کلوکیم کے انعقاد میں ایک ماہ رہ گیا تھا جب انھوں نے علامہ اسد کو بلا کر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا اور غالباً انھیں سخت سُست کہا، جس پر ناراض ہو کر علامہ اسد نے فوری طور پر استعفیٰ پیش کردیا۔ ۳۶

سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل جو اُس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی سے منسلک

تھے، ان کی رائے یہ ہے کہ علامہ اسد ''کانفرنس کے معاملات میں پوری دلچسپی نہ لے سکے''

اور وائس چانسلر میاں افضل حسین نے اُن سے ''کام جلدی نپٹانے کا تقاضا کیا، اس پر تکرار ہوئی'' ۳۸ ۳۷

لیکن کلوکیم کے بعد اخبارات و جرائد نے جو تبصرے کیے اُن میں بعض تبصروں سے علامہ اسد کے استعفیٰ کی کچھ اور وجوہ بھی معلوم ہوتی ہیں، جیسا کہ گزشتہ سطور میں ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ کچھ شکایات علامہ اسد کو تھیں اور استعفیٰ کا سبب محض انتظامی امور نہیں تھے جب کہ شیخ امتیاز علی صاحب اور ڈاکٹر افضل صاحب کی آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ شکایات وائس چانسلر صاحب کو تھیں ع اس کش مکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

تاہم وجوہ جو بھی تھیں علامہ اسد نے ۲؍دسمبر ۱۹۵۷ء کو ڈائریکٹر انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ اب یونیورسٹی کی طرف اُن کے واجبات بقایا تھے چنانچہ انھوں نے یونیورسٹی سے تین ہزار سات سو پچپن روپے کا مطالبہ کیا تاکہ وہ اور ان کی اہلیہ پاکستان سے واپس جاسکیں۔ اُن کا مطالبہ چانسلرز کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۵؍جنوری ۱۶۵۸ء میں زیرِ غور آیا۔ خزانہ دار نے یہ موقف اختیار کیا کہ کنٹریکٹ ملازمین کو واپسی کا ٹکٹ اُس صورت میں دیا جاتا ہے جب انھوں نے اپنے کنٹریکٹ کی مدت پوری کرلی ہو۔ علامہ اسد چونکہ کارِ مفوضہ کی تکمیل سے پہلے مستعفی ہوگئے ہیں اور انھوں نے استعفیٰ سے پہلے ایک ماہ کا نوٹس بھی نہیں دیا اس لیے انھیں اور ان کی اہلیہ کو واپسی کا ٹکٹ نہیں دیا جاسکتا۔ اجلاس کو بتایا گیا کہ علامہ اسد نے سپیشل کیس کے طور پر ایک ماہ کا نوٹس دینے کی شرط ختم کرنے کی درخواست کی ہے۔ اس پر طویل بحث و تمحیص ہوئی جس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک ماہ

کا پیشگی نوٹس دیے جانے کی شرط ختم کرتے ہوئے علامہ اسد کو مطلوبہ رقم دے دی جائے۔

چانسلرز کمیٹی کی روداد میں خزانہ دار کا موقف اس طرح رپورٹ کیا گیا ہے:

All temporary employee were required to give one month's notice if they resigned. Mr. Asad did not give the required notice. He had however requested that the condition of the notice be waived as a special case and that he be paid a sum of Rs. 3755 to cover his traveling expenses as well as those of his wife from Lahore to Bandoum, including incidental charges. The Treasurer was of the view that the payment of return fair for Mr. Asad and his wife could only have been admissible if the return journey would be under taken by Mr. Asad on the expiry of his period of his appointment. ؂۳۹

بحث و تمحیص کے بعد کیے جانے والے فیصلے کے الفاظ یہ ہیں:

After some discussion, resolved that the condition of one month's notice be waived and that Mr. Asad be paid the same amount as was paid to him for the inward journey. ؂۴۰

یہ تجربہ پنجاب یونیورسٹی اور علامہ اسد کے وصل کو دائمی فصل میں تبدیل کرنے کا باعث بنا۔ اس کے بعد حکومتِ پاکستان کی طرف سے انھیں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی سربراہی کی پیش کش کی گئی اور وائس چانسلر کے برابر منصب اور سرکاری خرچ پر اپنے ملک سے پاکستان آمد و رفت کی سہولتیں پیش کی گئیں۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی سربراہی کی پیش کش بھی کی گئی لیکن انھوں نے یہ مناصب قبول نہیں کیے۔

ان کے استعفیٰ کے بعد اسلامک کلوکیم حسبِ پروگرام ۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء سے

۸ر جنوری ۱۹۵۸ء تک لاہور میں منعقد ہوا اور اُس میں پیش کیے جانے والے مقالات کا مجموعہ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم پیپرز کے نام سے شائع کیا گیا [۱۸۱] لیکن اس میں علامہ اسد کا کوئی ذکر نہیں۔

حوالے اور حواشی

۱۔ البقرہ ۱۴۶ و الانعام ۲۰

۲۔ استثنا ۳۲:۲

۳۔ سید نذیر نیازی کے نام علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل مکتوبات میں علامہ اسد اور اُن کے اسلامیہ کالج لاہور سے انسلاک کے حوالے سے ذکر موجود ہے۔ مکتوب مورخہ ۲۷/ جون ۱۹۳۴ء (جس میں علامہ اسد کو خط لکھنے کا ذکر ہے) ۲۳/ جولائی ۱۹۳۴ء، ۲۸/ جولائی ۱۹۳۴ء، ۳۰/ جولائی ۱۹۳۴ء، ۱۱/ اگست ۱۹۳۴ء اور ۳۱/ اکتوبر ۱۹۳۴ء دیکھیے: سید مظفر حسین برنی کلیاتِ مکاتیبِ اقبال دہلی اُردو اکادمی جلد سوم ص ص ۵۲۹ و مابعد

۴۔ Muhammad Asad *Islam at the Crossroads* Lahore Arafat Publications 1934

۵۔ Ibid (some press opinions)

۶۔ M. Ikram Chughtai (ed.) Introduction *Muhammad Asad Europe's Gift to Islam* Lahore The Truth Society and Sang-e-Meel Publications 2006 vol. I p. iii

اسد کے سوانحی اشارات کے سلسلہ میں بھی اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ Muhammad Asad (Translated from the Arabic with explanatory notes) *SAHIH AL-BUKHARI* (Being traditions of the sayings and doings of the Prophet Muhammad / narrated by his companions to those who followed them / and compiled under the title Kitab Al-Jami As Sahih by Imam Abu ABD ALLAH Muhammad IBN Ismail Al-Bukhari) in 7 volumes about 40 instalments Lahore Arafat Publications.

۸۔ Muhammad Asad (Translated and Explained) *SAHIH AL-BUKHARI* The Early Years of Islam Gibraltar Dar al Andalus 1981 (Preface).

New York; Simon and Schuster 1954

۹ Berkeley; California: University of California Press 1961

۱۰ Mecca Muslim World League

۱۱ Gibralter Dar al Andalus 1987

۱۲ Gunther Windhager *Leopold Weiss alias Muhammad Asad Von Galizien nach Arabien* 1900-1927 Bohalu Wien

۱۳ M. Ikram Chughtai (ed.) op-cit vol. I & II pp. 1240

۱۴ محمد ارشد اسلامی ریاست کی تشکیلِ جدید..... محمد اسد کے افکار کا تنقیدی مطالعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور اپریل ۲۰۰۷ء

۱۵ *Proceedings of Meeting of the Syndicate* of the University of the Punjab, dated the 5-02-1949 paragraph 16, No. 1834/GM dated 19-02-1949.

۱۶ The Senate at its meeting held on 29th March, 1949 has approved the following items.

15 That the recommendations of the Syndicates relating to the appointment of the following persons in the various University teaching Departments be approved (vide paragraphs 16 & 2,3,32 and 38 of the Syndicates proceeding dated the 5th and 11th February 1949 respectively):-

1. Allama Muhammad Asad as honorary Head of the Department of Islamiyyat.

۱۸ *Poceedings meeting of Senate* March 30, 1950 Para No. 12

۱۹ مثال کے طور پر دیکھیے: مرقع صدیقی مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت لاہور مجلس فاضلین علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب لاہور پاکستان ۲۰۰۳ء ص ص ۱۴، ۷۹، ۱۸۵

۲۰ *Proceedings of Meeting of the Syndicate* of the University of

the Punjab, dated the 7-03-1950 paragraph 15, No. 15 after considering item no. 24 on the deffered agenda, it was decided to accept the resignation of Allama Muhammad Asad and to appoint Mr. Ala-ud-Din Siddiqi as honorary head of the Department of Islamiyyat in his place.

۲۱ علامہ اسد کو شعبہ اسلامیات کی سربراہی پیش کیے جانے کا ذکر سب سے پہلے راقم الحروف نے کیا لیکن جس کتاب میں یہ ذکر ہوا وہاں یہ مبحث زمانہء زیرِ بحث سے متعلق نہیں تھا اس لیے محض اس طرف اشارہ کیا جا سکا (تاریخ جامعہ پنجاب جلد دوم لاہور پنجاب یونیورسٹی ۲۰۰۴ء ص ۳۴۶) اب زیرِ نظر مضمون کے ذریعے وضاحت کی جا رہی ہے کہ علامہ اسد نے یہ معذرت منصب قبول کرنے کے بعد اور اس منصب پر گیارہ ماہ تک فائز رہنے کے بعد کی تھی۔

۲۲ All Pakistan Political Science Association Proceedings of the First All Pakistan Political Science Conference 1950 (Lahore, The Punjab University Press 1950)

بحوالہ محمد ارشد محولہ بالا ص ۱۲۵

۲۳ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب لاہور جامعہ پنجاب ۱۹۸۲ء ص ۲۶۱

۲۴ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور لاہور اورینٹل کالج ۱۹۶۲ء ص ۱۸۷

۲۵ Murad Wilfried Hofmann meeting Muhammad Asad (Lisbon 21 September 1985) included in *Muhammad Asad Europe's Gift to Islam* edited by M. Ikram Chughtai Lahore The Truth Society and Sang-e-Meel Publications 2006 vol. II page 1142

۲۶ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور اورینٹل کالج ۱۹۶۲ء ص ص ۲۲۸-۲۲۹

۲۷ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب لاہور جامعہ پنجاب ۱۹۸۲ء

ص ۲۹۰

۲۸ Alauddin Siddiqui Foreword *International Islamic Colloquium Papers* Decemebr 29, 1957- January 8, 1958 Lahore Punjab University Press 1960 p.VII

۲۹ *Proceedings of the Chancellor's Committee*, University of the Punjab, Lahore dated 25th January 1958.

۳۰ *Proceedings of the Chancellor's Committee*, University of the Punjab, Lahore dated 30th March 1957.

۳۱ *Proceedings of the Chancellor's Committee*, University of the Punjab, Lahore dated 20th April 1957.

۳۲ *Proceedings of the Chancellor's Committee*, University of the Punjab, Lahore dated 30th November 1957.

۳۳ صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب محولہ بالا جائے مذکور

۳۴ اشارات ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی لاہور دفتر رسالہ ترجمان القرآن جمادی الآخر ۱۳۷۷ھ جلد ۴۹ عدد ۴ ص ۱۱

۳۵ محمد ارشد محولہ بالا

۳۶ پروفیسر شیخ امتیاز علی سے راقم الحروف کی ٹیلی فونی گفتگو ۱۹؍جون ۲۰۰۷ء

۳۷ ڈاکٹر محمد افضل در یارانِ مکتب جلد دوم حصولِ پاکستان کی جدوجہد عینی شہادتیں مرتبہ بیدار ملک لاہور پاکستان سٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی قائد اعظم کیمپس ۱۹۹۲ء ص ص ۲۱۳۔۲۱۴

۳۸ ایضاً

۳۹۔۴۰ *Proceedings of the Chancellor's Committee*, University of the Punjab, Lahore dated 25th January 1958.

۴۱ دیکھیے حوالہ نمبر ۲۴

ایک نادر نظم کی دریافت

(مولانا ظفر علی خان، شمس الحسن اور پاکستان کا درزی)

راقم الحروف مولانا ظفر علی خان کے حوالے سے ایک تحقیقی منصوبے پر کام کر رہا
ہے اس تحقیق کے دوران میں اسے مولانا مرحوم کی ایک نادر نظم اور ان کا ایک خط دستیاب ہوا
ہے، یہ نظم قائدِ اعظم کے حوالے سے کہی گئی ہے اور خط اسی نظم کی مناسبت سے لکھا گیا ہے،
جس کے مکتوب الیہ مسلم لیگ کے سیکریٹری سید شمس الحسن ہیں۔ اس نظم کو مولانا نے اپنے قلم
سے پاکستان کا درزی کا عنوان دیا ہے، نظم کا آغاز ایک استفہام سے ہوتا ہے، شاعر بہ
زبان ہاتف ملتِ بیضا سوال کرتا ہے کہ: ملت، سایہ ادبار سے کب باہر آئے گی۔ خداوندانِ
مغرب اپنی روش کب تبدیل کریں گے، مسلمانوں کا خون کب تک ملوکیت کے پیراہن کو
رنگین کرنے کے کام آتا رہے گا، بطحا کی خانہ ساز شراب کا دور کب چلے گا اور مسلمانانِ برِ صغیر

اپنی گمشدہ آزادی وخود مختاری کے حصول میں کب کام یاب ہوں گے؟ نظم کے آخری دو
شعروں کو ان سوالات کا جواب دینے کے لیے الگ کیا گیا ہے لیکن اس سے پہلے اسی سلسلہ
استفہام میں ملت کی قامت پر قبائے سلطنت کے موزوں ہو جانے کی تمنا کا اظہار کرتے
ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ

کرے گا اس کو پاکستان کا درزی رفو کب تک

نظم کے متن میں مولانا نے پاکستان کا درزی پر حاشیے کا نشان لگا کر نظم کے
اختتام پر اسی نشان کے ساتھ لکھا ہے 'قائدِ اعظم محمد علی جینا' (مولانا ظفر علی خان کے
ہاں جناح کا یہی املا پایا جاتا ہے) اس صراحت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ملت کے ادبار سے
متعلق شاعر نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا عملی جواب پاکستان کے درزی کے پاس ہے
اور شاعر کو اس دن کا انتظار ہے جب پاکستان کا درزی پریشان حال ملتِ اسلامیہ کے حال
کو روشن استقبال میں تبدیل کر دے گا۔ درزی کا لفظ گو شاعرانہ نہیں اور خو، جستجو، سبو وغیرہ
قوافی کے تسلسل میں رفو کی رعایت سے لایا گیا ہے لیکن اس سے شاعر کی نگاہوں میں
قائدِ اعظم کی عظمت اور وقعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان جو قیامِ مسلم لیگ
کے وقت سے قومی جدوجہدِ آزادی میں شریک ہیں قائدِ اعظم کو اپنا راہ نما تسلیم کر چکے ہیں اور
ان کی نگاہوں میں مستقبل کی امیدیں قائد اعظم ہی سے وابستہ ہو چکی ہیں، یہاں تک
جدوجہد کے راہ نما کی نشان دہی تھی اس کے بعد کے دو شعروں میں اصل کلیدِ کام یابی کا بیان
کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک راہ نما کے مل جانے سے بھی اہم یہ
بات ہے کہ قوم اپنے فکر و عمل کی دنیا میں انقلاب پیدا کرے، یہ انقلاب جذبہ قربانی کے بغیر
پیدا نہیں ہو سکتا، حصولِ منزل کے لیے ضروری ہے کہ ملت آبِ خنجر سے وضو کرنا سیکھے، جب

تک قربانی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوگا تمام تر تمناؤں کے باوجود حصولِ منزل میں کام یابی
نہیں ہوگی، چنانچہ شاعر، ملت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

نہ آئے گا خدا کی راہ میں جب تک اسے مرنا
بہائے گی نہ اس رستہ میں وہ اپنا لہو جب تک

صبح دم ملتِ بیضا سے پوچھے گئے ہاتف کے سوال کا یہی جواب ہے۔

یہ نظم جسے ان سطور کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے ایک تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے اور مولانا کے کسی شعری مجموعے میں موجود نہیں، اس سے پہلے قائدِ اعظم کے حوالے سے، مولانا کی فقط ایک نظم ملتی ہے، اس نظم کا عنوان ''چرخہ اور تلوار'' رکھا گیا ہے، لیکن بعدازاں یہ قائداعظم سے خطاب کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ [۱]

اس ایک نظم کے سوا مولانا کے تمام مجموعہ ہائے کلام میں قائداعظم کے بارے میں اور کوئی نظم نہیں ملتی۔ بعض نظموں میں ضمنی طور پر قائداعظم کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کے پس منظر کے حوالے سے بھی کچھ عرض کیا جائے۔ اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خان کو ۱۹۴۱ء کی علی گڑھ مسلم لیگ کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت دی گئی تھی، یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا ظفر علی خان اپنی تنظیم مجلس اتحادِ ملت کو غیر فعال کر کے اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں مسلم لیگ اور قائداعظم کے سپرد کر چکے تھے، لیکن وہ اپنی علالت طبع کے باعث اس کانفرنس میں شرکت کے لیے علی گڑھ کا سفر نہ کر سکے، چنانچہ انھوں نے اس غیر حاضری کی تلافی کے لیے ایک نظم کہی اور یہ نظم مسلم لیگ کے سیکریٹری سید شمس الحسن کو بھجوائی تا کہ وہ اس نظم کو کانفرنس میں کسی موزوں موقع پر مولانا ظفر علی خان کے پیغام کے طور پر پڑھ سکیں اس نظم کے ساتھ مولانا ظفر علی خان نے سرپوش

مراسلے کے طور پر شمس الحسن کے نام مختصر خط بھی لکھا جس پر دہلی اور یکم نومبر ۱۹۴۱ء درج ہے، جس سے اس نظم کے مقامِ تخلیق اور زمانہ تخلیق کا علم ہو جاتا ہے۔ ذیل میں یہ تاریخی تحریر نقل کی جارہی ہے اور ان سطور کے ساتھ مولانا ظفر علی خان کا یہ غیر مطبوعہ خط اور قائداعظم کے بارے میں ہماری قومی تاریخ کی اس اہم شخصیت کے منظوم خیالات کا عکس بھی شائع کیا جارہا ہے۔

Legislative Assembly

دہلی

یکم نومبر ۱۹۴۱ء

مکرمی ومخدومی۔ السلام علیکم

میں نے بہت کوشش کی کہ علی گڑھ پہنچ کر مسلم لیگ کانفرنس میں شرکت کی عزت حاصل کروں لیکن طبیعت کی ناسازی سنگِ راہ ہوگئی۔ اس کی تلافی کے لیے نظمِ ذیل حاضر ہے۔ کسی موزوں موقعہ پر اسے کانفرنس میں میری طرف سے پڑھ کر سنا دیجئے۔

دعاگو

ظفر علی خان

پاکستان کا درزی

گجر دم ملت بیضا سے پوچھا آج ہاتف نے
کہ چھوڑیں گے خداوندانِ مغرب اپنی خو کب تک

ملوکیت کے پیراہن کی رنگینی کو مشرق میں
رہے گی میرے خونِ ناروا کی جستجو کب تک

شرابِ خانہ ساز آئے گی کب بطحا کی بھٹی سے
رہیں گے فارغ اس کے دور سے جام و سبو کب تک

قبائے سلطنت قامت پہ کس دن راس آئے گی
کرے گا اس کو پاکستان کا درزی* رفو کب تک

ندا آئی کہ مقصد تک پہنچ سکتی نہیں ملت
نہ سیکھے گی وہ کرنا آب خنجر سے وضو جب تک

دہلی

یکم نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

مکرمی و محترمی — السلام علیکم

میں نے بہت کوشش کی کہ علی گڑھ پہنچ کر مسلم لیگ کانفرنس میں شرکت کی عزت حاصل کروں لیکن طبیعت کی ناسازی سد راہ ہو گئی۔ اس کی تلافی کے لیے نظم ذیل حاضر ہے۔ کسی موزوں موقع پر اسے کانفرنس میں میری طرف سے پڑھ کر سنا دیجئے۔

دعاگو

ظفر علی

پاکستان کا ورد

گزر ہم ملت بیضا سے پوچھیں آج ہاتف نے کہ چھوڑیں گے خداوندان مغرب اپنی خو کب تک

کھیلیں گے پیراہن کی رنگینی و مشرق میں رہے گی ان سے خون ناروا کی جستجو کب تک

شراب خانہ ساز تہذیب کی سب بیچنا کی لٹیں سے رہیں گے فارغ الحال کے دور جام و سبو کب تک

تباہ سلطنت قائم پر کسی دن آئے گی گرے گا اس کو پاکستان کا دروازہ رفو کب تک

خدا آئی کہ مقصد تک پہنچ سکتی نہیں ملت نہ سیکھے گی وہ کرنا آب خنجر سے وضو جب تک

نہ آئے گا خدا کی راہ میں جب تک اسے مرنا

بہائے گی نہ اس رستہ میں وہ اپنا لہو جب تک

بنام قائد اعظم محمد علی جناح

SOURCE

SHAMSUL HASAN COLLECTION
NATIONAL DOCUMENTATION CENTRE, CABINET DIVISION, ISLAMABAD

نہ آئے گا خدا کی راہ میں جب تک اسے مرنا
بہائے گی نہ اس رستہ میں وہ اپنا لہو جب تک

* قائداعظم محمد علی جینا

....

ضروری ہے کہ یہاں مولانا ظفر علی خان کے مکتوب الیہ سید شمس الحسن اور اس تاریخی دستاویز کے مآخذ کی بابت بھی کچھ بتایا جائے ، سید شمس الحسن مرحوم ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے ۲ے بریلی اور آگرہ میں تعلیم حاصل کی ، ۱۹۰۹ء میں مسلم لیگ کے دفتر سے بحیثیت ٹائپسٹ منسلک ہوئے ، جولائی ۱۹۱۴ء میں آفس سیکریٹری بنا دیے گئے اور ۱۹۴۷ء تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے ، وہ مسلم لیگ کے سرکاری ترجمان اور قائداعظم کے جاری کردہ اخبارات روزنامہ ڈان اور منشور کے ناشر بھی تھے، لیکن مسلم لیگ کے ساتھ ان کی وابستگی اتنی گہری ہوگئی کہ انھیں مسلم لیگ کا اسسٹنٹ سیکریٹری بنا دیا گیا اور وہ چوالیس سال تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ قائداعظم ان پر غیر معمولی اعتماد کرتے تھے، قائداعظم نے پہلی بار شمس الحسن کی درخواست پر ہی ترکی ٹوپی زیبِ سر کی تھی ۔ یہی ٹوپی ہے جو قائداعظم کی ۱۹۱۶ء، ۱۹۳۶ء وغیرہ کی تصویروں میں ان کے سر پر دکھائی دیتی ہے اور یہی ٹوپی ہے جو بعد ازاں جناح کیپ میں تبدیل ہوگئی۔ ہماری قومی تاریخ کے مختلف مرحلوں پر شمس الحسن کے نام قائداعظم کے خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ جدوجہدِ آزادی میں شمس الحسن کس طرح قائداعظم کے ساتھ رہے، ان کے حوالے سے قائداعظم کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے کہ ''مسلم لیگ کیا ہے، میں شمس الحسن اور ان کا ٹائپ رائٹر'' ۳ے شمس الحسن اکتوبر ۱۹۵۸ء تک مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکریٹری رہے جب ایوب خان کے مارشل لانے

سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کردی۔ بعدازاں ایوب خان کے زمانے میں انھیں ۱۹۶۴ء میں بڑے احترام اور بڑی پیش کشوں کے ساتھ مسلم لیگ کی سرپرستی کی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ ''یہ قائداعظم کی مسلم لیگ نہیں ہے'' ۴

کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ کے حقیقی روح رواں اصحاب ثلاثہ تھے یعنی قائداعظم، لیاقت علی خان اور شمس الحسن ۵ سید شمس الحسن کی شخصیت کی تصویر ڈاکٹر زوار حسین زیدی نے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

''ایک بزرگ، درمیانہ قد، سفید داڑھی، نورانی چہرہ انتہا پان کھانے کی وجہ سے ہونٹ ہمیشہ سرخ لبوں پر مسکراہٹ، چوڑی دار پاجامہ اور سفید کرتا (کرتے پر پان کی چھینٹوں کے کچھ داغ بھی تھے) پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمر میں بل نہ تھا۔ آنکھیں چمکتی ہوئی، آواز میں نرمی، لہجہ میں کرختگی یہ تھے جناب شمس الحسن'' ۶

پاکستان بن جانے کے بعد بقول پیر علی محمد راشدی ''قوم کو شمس الحسن جیسے لوگوں کی ضرورت نہیں رہی تھی'' ۷ طویل عرصے تک گم نامی کی زندگی گزارنے کے بعد قوم کا یہ غیر معمولی فرزند ۷/نومبر ۱۹۸۱ء پیر شام ساڑھے چار بجے خالق حقیقی سے جاملا اناللہ وانا الیہ راجعون

سید شمس الحسن کے نام مولانا ظفر علی خان کا خط اور قائدِاعظم سے متعلق نظم ہمیں قومی دستاویزات کے ذخیرۂ شمس الحسن سے حاصل ہوئے ہیں، اس ذخیرے کے بارے میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ یہ دراصل ذخیرۂ قائداعظم ہے، یا اسے ذخیرۂ قائداعظم بھی کہا جاسکتا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تقسیم ہند کے زمانے میں قائداعظم دہلی میں تھے انھوں نے ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو شمس الحسن کو ملاقات کے لیے بلایا اور انھیں اپنی ذاتی

دستاویزات دکھاتے ہوئے کہا کہ وہ ان دستاویزات کے امین ہوں گے۔ شمس الحسن نے لکھا ہے کہ:

" After a few minutes, the Quaid led me to an adjacent room; and pointing towards a stack of gunny bags, he told me that they contained some of his personal letters and papers, which he asked to take with me. I enquired whether I had to destroy or preserve them. He replied: "No. I shall like you to see that they are not destroyed in the holocaust. You keep them in your personal custody". I therefore, brought those bags to my house. The next day, I left Delhi for Karachi to attend the ceremonies that were to herald the birth of Pakistan on August 14." 8

قیام پاکستان کے بعد شمس الحسن کراچی میں مسلم لیگ کا دفتر قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے اور فوری طور پر ان دستاویزات کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ قائداعظم سے کراچی میں ہونے والی چند ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ان چند ملاقاتوں میں بھی ایک بار قائداعظم نے ان دستاویزات کے بارے میں دریافت فرمایا کہ آیا میں نے انھیں مرتب کرلیا ہے، میں نے انھیں بتایا کہ مسلم لیگ کا دفتر قائم کرنے کی مصروفیت کے باعث میں اب تک اس ضمن میں کچھ نہیں کرسکا ہوں۔ قائداعظم نے بارِدگر مجھ سے یہ کہا کہ یہ دستاویزات کم از کم بیس برس تک شائع نہیں ہونی چاہییں 9

شمس الحسن ایک خواب بیان کرتے ہیں جس میں وہ ایک قائداعظم میوزیم دیکھ رہے ہیں، جہاں ایک کمرہ الماریوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ الماریاں مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد،

اخبارات اور جرائد سے پُر ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ مذکورہ دستاویزات اس ادارے میں محفوظ ہونی چاہییں۔ [۱۰] اپنے اس خواب کی تعبیر کے طور پر انھوں نے Plain Mr. Jinnah کے نام سے ۱۹۷۶ء میں ایک انگریزی مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا [۱۱]۔ اس مجموعے کو شمس الحسن کے خواب کی تعبیر کا پہلا جز و کہنا چاہیے۔ شمس الحسن ۷/ نومبر ۱۹۸۱ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ذخیرۂ شمس الحسن ان کی اولاد کے تصرف میں آ گیا۔ شمس الحسن مرحوم کے چھ بیٹے تھے جن میں مشہور بینکار خالد شمس الحسن اور صحافی واجد شمس الحسن بھی شامل ہیں۔ حکومت پاکستان کی کیبنٹ ڈویژن کے ادارہ برائے تحفظ قومی دستاویزات (نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر) نے اس قومی سرمایے کے حصول کے لیے مرحوم کے بیٹوں سے رابطہ کیا، دیر تک اس موضوع پر گفت وشنید ہوتی رہی۔ نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر نے حکومت کی طرف سے اس ذخیرے کے عوض پچاس لاکھ روپے تک کی پیش کش کی لیکن شمس الحسن مرحوم کے بیٹوں نے کچھ عرصہ قبل یہ ذخیرہ بلا قیمت حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا ہے۔ اب یہ ذخیرہ ۲۷ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جن میں تحریک آزادی کی قریباً تمام شخصیات سے متعلق دستاویزات یا ان کے خطوط موجود ہیں۔ دس ہزار کے قریب دستاویزات اور کتابیں ان ۲۷ مجلدات کے علاوہ ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کا خط اور قائد اعظم کے بارے میں ان کی نظم جو ان سطور کے ساتھ اشاعت پذیر ہو رہے ہیں اس ذخیرے کی آٹھویں جلد میں شامل ہیں، اس جلد کا نام Punjab III رکھا گیا ہے اور اس میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک کی دستاویزات شامل ہیں۔ اس نادر دستاویز تک رسائی میں تعاون کے لیے راقم الحروف نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر، اس کے ڈائریکٹر سلیم اللہ خان صاحب اور ڈپٹی ڈائریکٹر رانا سلیم اقبال صاحب کا ممنون ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ دیکھئے: ظفر علی خان، چمنستان، لاہور: پبلشرز یونائیٹڈ ۱۹۴۴ء ص ۲۶۲ مولانا ظفر علی خان نے عنوان تبدیل کرتے ہوئے نظم کے متن میں بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں ان متنی تبدیلیوں کے لیے: زاہد منیر عامر (مرتب) مکاتیب ظفر علی خان، لاہور: سنی پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء ص ص ۳۲۲--۳۲۵

۲۔ بعض اصحاب نے ان کا سال ولادت ۱۸۸۷ء لکھا ہے مثلاً دیکھئے اسد سلیم شیخ، انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۹ء ص ۵۹۴

۳۔ سید قاسم محمود (مدیر و مولف) انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، کراچی: شاہکار بک فاؤنڈیشن مارچ ۱۹۹۸ء ص ۶۰۳

۴۔ جمیل الدین عالی، کالم نقار خانے میں (سید شمس الحسن مرحوم بڑی تاریخ بڑی شخصیت) روزنامہ جنگ، راولپنڈی ۱۳ر نومبر ۱۹۸۱ء

۵۔ پیر علی محمد راشدی، کالم مشرق و مغرب (سید شمس الحسن مرحوم شکست جام حریفان شدند، مرد چراغ) روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۶ر نومبر ۱۹۸۱ء

۶۔ زوار حسین زیدی، ڈاکٹر (مضمون) مرحوم شمس الحسن جو مسلم لیگ کی چلتی پھرتی تاریخ تھے روزنامہ جنگ لندن ۱۷ر نومبر ۱۹۸۱ء

۷۔ پیر علی محمد راشدی، کالم مشرق و مغرب، محولہ بالا

۸۔ Shamsul Hasan Syed (ed) *Plain Mr. Jinnah Karachi* Royal Book Company 1976 P. 2

۹۔ I met the Quaid at Karachi quite a few times before he left for Ziarat during his last illness in 1948. It was only once that he broached the subject of the papers and enquired whether I had arranged and sorted them. I informed him that I had not done anything with

them, as I was busy setting up the League Office. He told me afresh not to publish them for at least twenty years.

۱۰ Shamsul Hasan Syed (ed) *Plain Mr. Jinnah* Op-Cit P. 3

۱۱ اس مجموعے کا نام خود قائداعظم کے ایک خط سے لیا گیا ہے، اپریل ۱۹۴۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے قائداعظم کو ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن قائداعظم نے یہ ڈگری قبول نہ کی، انتظامیہ نے اصرار کیا، قائداعظم نے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

I have lived as plain Mr. Jinnah and I hope to die as plain Mr. Jinnah.

دیکھیے: *Plain Mr. Jinnah* ص ۶۹

ذخیرہ شمس الحسن کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک زمانے میں یہ قیمتی ذخیرہ کراچی سے لاہور لایا گیا، لاہور سے واپس کراچی پہنچا اور کراچی سے پھر اسے اسلام آباد لے جانے کی تجویز ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق یہ دستاویزات ایک زمانے میں مسلم لیگ کے مرکزی دفتر لکشمی بلڈنگ لاہور میں آ گئی تھیں، مسلم لیگ ہاؤس پاکستان انشورنس کارپوریشن کو الاٹ کیا جا چکا تھا، شمس الحسن ان دستاویزات کی نسبت غافل نہیں ہوئے اور انھوں نے وزیر خارجہ منظور قادر کو اس عدم توجہی کی طرف متوجہ کیا جس پر یہ دستاویزات پاکستان سیکریٹریٹ کی بارکوں میں منتقل ہوئیں اور پھر اواخر ۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی کے حوالے کی گئیں (ولی مظہر، ایڈووکیٹ عظمتوں کے چراغ جلد سوم، ملتان مجلس کارکنان تحریک پاکستان ۱۹۸۹ء ص ۴۲۱-۴۲۲) لیکن ڈاکٹر زوار حسین زیدی کی ایک تحریر مظہر ہے کہ یہ ذخیرہ کراچی سے کہیں اور منتقل نہیں ہوا انھوں نے لکھا ہے:

"میں ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو کراچی پہنچا تھا جب صدر ایوب نے احکامات جاری کیے تھے کہ

تمام ریکارڈز اسلام آباد منتقل کر دیا جائے جیسا کہ ایک بار پھر حکومت نے ابھی فیصلہ کیا ہے اس وقت تو ڈاکٹر قریشی (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی......؟ ناقل) زندہ تھے کہ جن کے ذریعے سے میں نے یہ ریکارڈ منتقل ہونے سے رکوا دیا۔'' دیکھئے روزنامہ جنگ لندن میں ڈاکٹر زوار حسین زیدی کا مضمون محولہ بالا

اسلام اور پاکستان
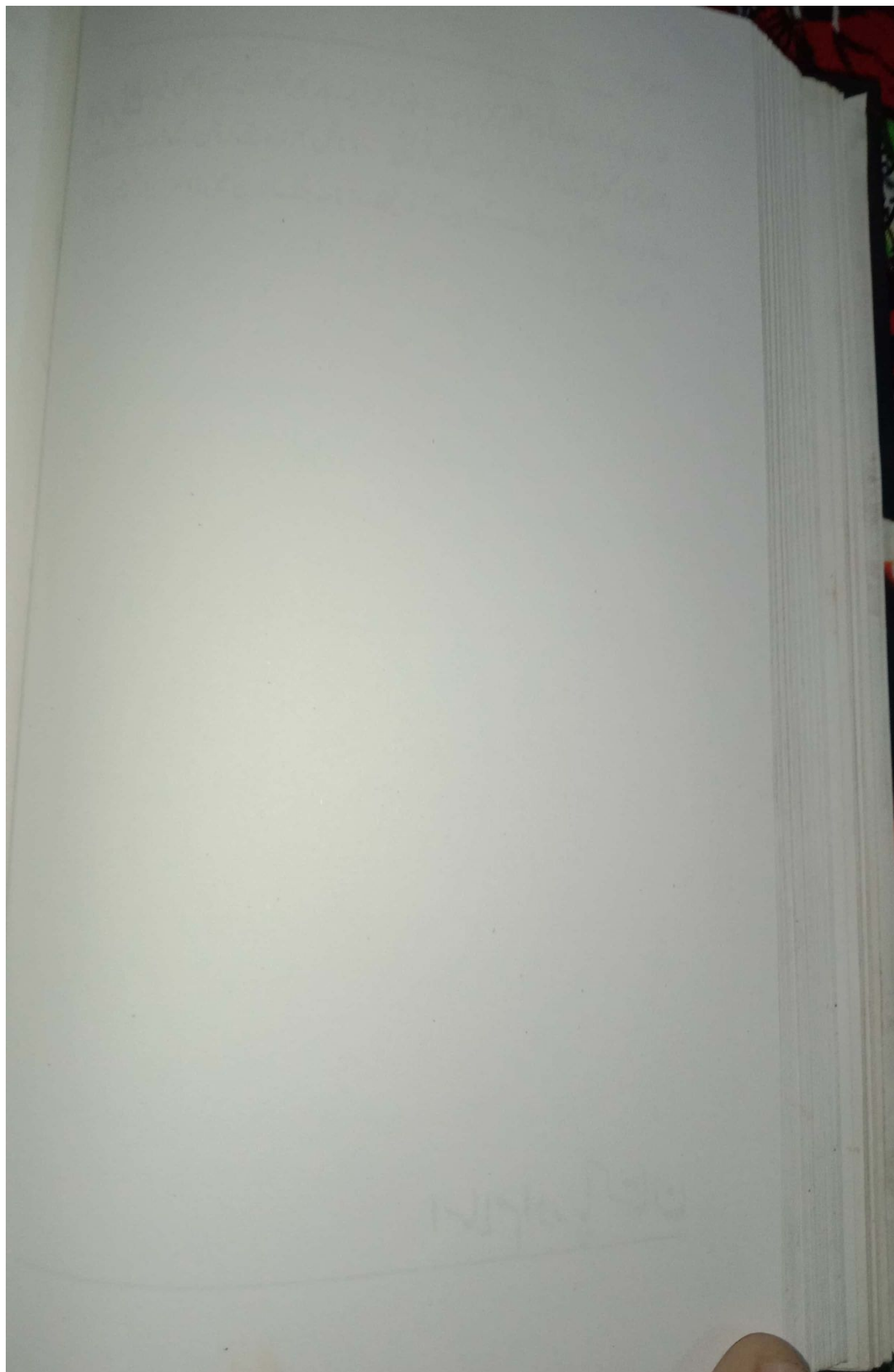
بنیاد پرستی ...... اصطلاح یا رویّہ

فنڈامینٹل ازم یا بنیاد پرستی اہلِ مشرق کے لیے نسبتاً ایک نئی اصطلاح ہے جب کہ مغرب اس اصطلاح سے گزشتہ دو صدیوں سے مانوس چلا آرہا ہے۔ یورپ میں یہ اصطلاح دو مختلف مگر قریب المفہوم معانی میں مستعمل رہی ہے۔ اولاً: قدامت پرست عیسائیوں کی ایک خاص شدت پسند قسم کو مشخص کرنے کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی گئی۔ ثانیاً: یہ اصطلاح ایک خاص عیسائی تحریک کے نام کے طور پر سامنے آئی، جس نے اپنا ایک الگ اصول پرستانہ پروگرام، جسے بنیاد پرستی کے پانچ نکات کہا گیا، پیش کیا اور جس کی باقاعدہ تنظیمیں اور ایجنسیاں ہیں اور وہ اپنے نقطۂ نظر کو غیر استثنا پذیر سچے عیسائی ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

عیسائیت میں یہ طبقات انیسویں صدی میں تاریخ اور ادب کے تنقیدی اسالیب

کے زیرِ اثر بائبل کے تجزیاتی مطالعوں کی روش کے ردّ عمل کے طور پر پیدا ہوئے۔ عیسائی جمہور کے نزدیک اس روش سے مذہب میں نئے اور خلل پذیر عناصر کا اضافہ ہونے لگا جن کے خلاف مذہبی مطالعے کے قدیم اسالیب کے حامی سامنے آ گئے اور انھوں نے جدید آزادی پسندانہ رجحانات کو مسترد کرنا شروع کر دیا ایسے عناصر مختلف اجزا میں بنیاد پرست کہلانے لگے اور انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی تک ان کی مخالفت میں اٹھنے والی آوازیں غیر موثر ہوتی گئیں۔ عام طور سے لبرلز (Liberals) اپنے مخالفین کے لیے فنڈامینٹلسٹ (Fundamentalist) کی اصطلاح استعمال کرنے لگے اور پھر کنزرویٹوز (Conservatives) نے خود بھی اسے اپنے لیے اختیار کر لیا اور یوں کہ اس اِصطلاح سے موسوم ہونے والے عیسائی گروہ کلاسیکی تقلید پرستی تک پہنچ گئے جن کے ہاں بعض مغربی مفکرین کے مطابق سوائے اس کے کوئی نئی بات نہ تھی کہ وہ ہر نئی بات کے خلاف تھے۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں یہ اصطلاح مغربی دنیا کی طرف سے ایشیا اور دیگر اسلامی ممالک کے مذہبی طبقوں کے لیے استعمال کی گئی ہے تو اس اصطلاح کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ مغرب کے نزدیک فنڈامینٹلسٹ سے مراد وہ مسلمان طبقات ہیں جو مذہب کی کلاسیکی تشریحات پر اکتفا کرتے ہیں اور جدید نظریات اور تحقیقات کو مسترد کرتے ہیں۔ یہاں عہدِ حاضر کے منظر نامے کے حوالے سے دو بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں اوّل یہ کہ کیا اہلِ اسلام کو فنڈامینٹلسٹ کہلوانا چاہیے؟ ہمیں امید ہے کہ قارئین ''ہونے'' اور ''کہلوانے'' کے نازک فرق کو بخوبی سمجھتے ہیں اس لیے ہم اس فرق کی وضاحت سے درگزر کرتے ہوئے پہلے فنڈامینٹلسٹ ہونے کے

مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

کوئی بھی شجر اپنی جڑوں سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا، نظریے اور عقیدے کی اساس پر استوار کسی بھی قوم کی عمارت اسی وقت مضبوط اور مستحکم ہو سکتی ہے جب وہ اپنی بنیادوں پر کھڑی ہو۔ اگر عمارت کے پائین سے اس کی بنیادیں نکال لی جائیں تو عمارت کب باقی رہے گی؟ شبلی نعمانی نے ایک جگہ شاعرانہ انداز میں کہا ہے کہ دوسری قوموں کی ترقی اس بات میں ہے کہ وہ آگے بڑھیں، آگے بڑھیں اور آگے بڑھیں لیکن مسلمانوں کی ترقی اس میں ہے کہ وہ پیچھے ہٹیں، پیچھے ہٹیں یہاں تک کہ نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم کے عہدِ مبارکہ تک جا پہنچیں۔ لیکن کیا پیچھے ہٹنے کا یہ عمل دنیوی ترقیوں، ایجادات اور اکتشافات سے لاعلمی کو مستلزم ہے......؟ ہرگز نہیں! مسلمان عقیدے کی صلابت اور ایمان کی حلات کے لیے پیچھے دیکھتا ہے لیکن تسخیرِ عالم کے لیے اس کی نگاہ سامنے کی طرف اٹھتی ہے، دوسرے لفظوں میں وہ پیچھے سے کمک لے کر آگے بڑھتا ہے۔ گویا ماضی سے ہمارا تعلق دوش کے آئینے میں فردا کو دیکھنے کے لیے ہے رجعتِ محض کے لیے نہیں۔

ہمارے ظریف شاعر اکبر الہ آبادی نے بڑی سادگی اور دانائی سے ایک مسلمان کا لائحہ عمل بیان کر دیا ہے

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نام ور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو

اکبر نے اس مضمون کو توسیع دیتے ہوئے جدید تعلیم و تہذیب کے مثبت عناصر کو قبول کرنے کی ایک شرط بھی بیان کی ہے، یہ ایک کلیدی نکتہ ہے اسے بہ ہر حال ملحوظ رکھنا چاہیے۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں پہ چڑھو، چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخنِ بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ کیا مسلمانوں کو بنیاد پرست کہلوانا چاہیے......؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ فی زمانہ اہلِ مغرب نے مسلمانوں کے لیے یہ اصطلاح ایک طعنے کے طور پر استعمال کی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں مسلمانوں کو'' هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ'' کی رو سے ''مسلمین'' کے نام سے موسوم کیا ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ ہمارا نام کل بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے (مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا) گویا یہ کہہ کر قرآنِ حکیم نے اس نام پر مہرِ دوام ثبت کر دی ہے۔ اس قرآنی نام کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور نام کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بنیاد پرست ایک ایسی ہی اصطلاح ہے جیسی کچھ عرصہ پہلے پان اسلامسٹ (Pan Islamist) کی اصطلاح تھی۔ یہاں ہم پان اسلامزم کی اصطلاح کے درست یا نادرست ہونے کی بحث کو چھوڑتے ہیں۔ ہم اپنی توانائیاں اور توجہات اس لایعنی تفکر میں کیوں صرف کریں؟ جب کہ ہمیں اپنا اصل نام بہت عزیز بھی ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب ہم، ہر قوم کی، اپنی اساس سے، استوار

رابطے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر ہم بنیاد پرست کہلوانے سے گریز کیوں چاہتے ہیں؟ یہاں ہم ماضی قریب کی اس مثال سے اپنا موقف واضح کریں گے کہ جب بعض سائنسی تحقیقات کا ظہور ہوا تو کچھ حلقوں نے اسلام کی صداقت کے دلائل ان سائنسی تحقیقات سے حاصل کرنا شروع کر دیے حالانکہ تحقیق تو اعتباری ہوتی ہے آج یا کل نئی تحقیقات ، ان نتائجِ تحقیق کو مسترد کر دیں تو کیا مذہب کی صداقت بھی (معاذاللہ) قصہ پارینہ بن جائے گی؟

اس لیے جیسے ہمارے ایمان کو کسی سائنسی سہارے کا محتاج نہیں ہونا چاہیے، اسی طرح مذہب کی اساسیات سے ہمارا تعلق نئی دنیا یا مغرب یا کسی اور طاقت کی طرف سے دیے ہوئے کسی نام سے بلند و بالا ہونا چاہیے۔

روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ہر مرتبہ کسی نئے نام سے پکارا جائے تو وہ اسے پسند نہیں کرتا...... یا اس سے پوچھا جائے کہ کیا آپ الف، ب، جیم کہلوانا پسند کرتے ہیں؟ تو اس کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے وہ شرافت طبعی کے ساتھ اپنا اصل نام دوہرائے گا اور کسی نئے نام کو قبول کرنے سے گریز کرے گا۔ یوں بھی فنڈامینٹلسٹ کا ترجمہ بنیاد پرست کیا جاتا ہے...... مسلمان کسی بنیاد یا عمارت کی پرستش نہیں کرتا وہ صرف ایک اللہ کی پرستش کا قائل ہے۔

اس لیے ہمیں صرف مسلمان کہلوانا چاہیے، دوسروں کے دیے ہوئے القاب اختیار یا قبول کرنے سے گریز ہی مناسب ہے۔ اسلام ایک الہامی دین ہونے کے ناتے انسانوں کے کسی سند نامے کا محتاج نہیں ہے۔ اسے کسی نئی اصطلاح کی ضرورت ہے نہ اس کے لیے وضاحتیں پیش کرنے کی۔ (۱۹۹۳ء)
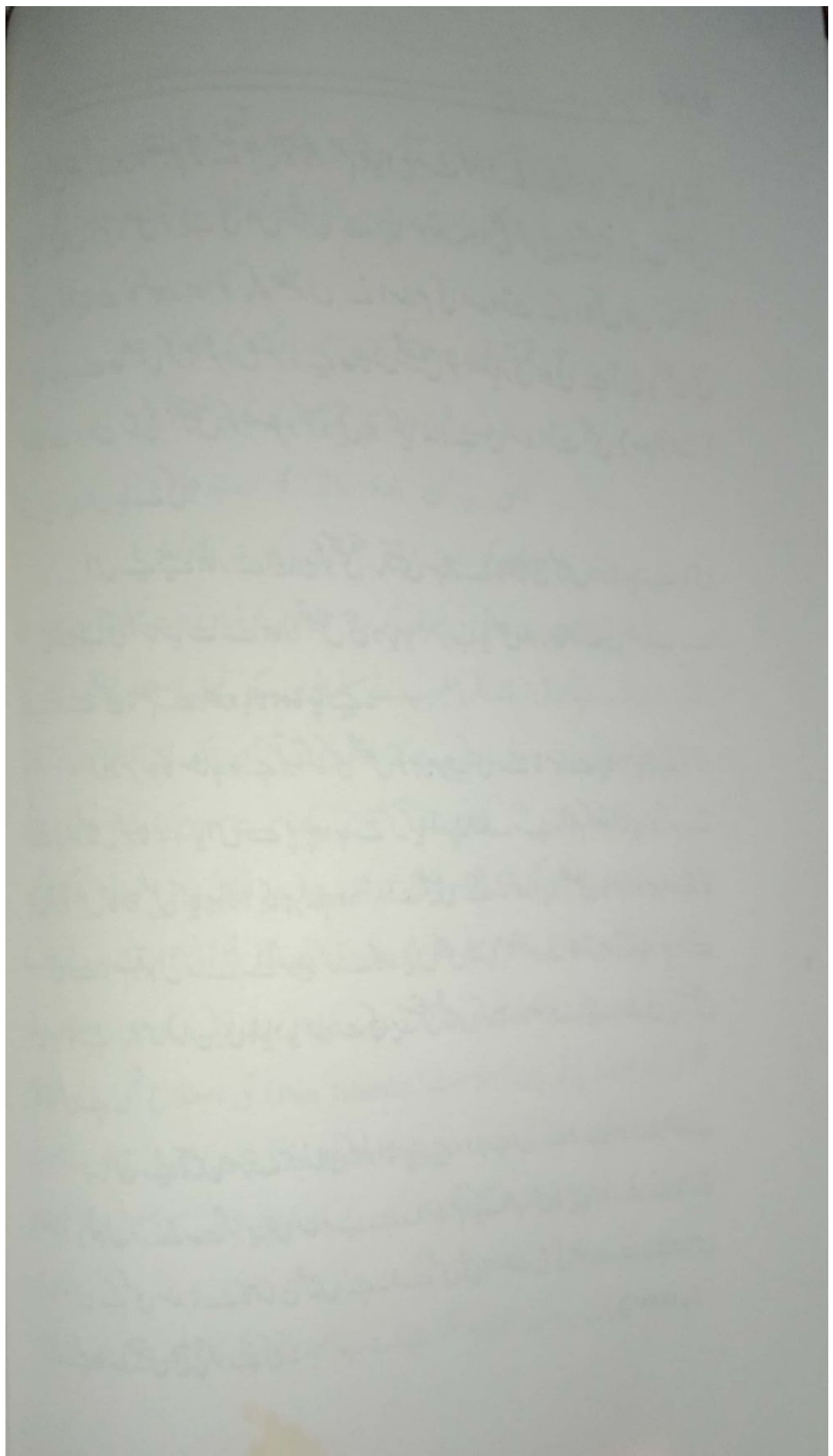
مولانا علی میاں اور پاکستان

کچھوے اور خرگوش کی کہانی بہت پرانی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ بعض کہانیاں پرانی ہونے کے باوجود نئی لگتی ہیں اور گزرتا ہوا وقت ان کی کہنگی پر مہرِ تصدیق ثبت نہیں کرتا۔۱۹۷۸ء میں اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے ایک استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دورِ حاضر میں عالمِ اسلام کی صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اسی کہانی کو بطورِ تلمیح استعمال کیا تھا...... روایتی کہانی میں خرگوش بہت تیز رفتار تھا اور کچھوا سست رفتار لیکن خرگوش سورہا اور کچھوا مسلسل محوِ سفر رہا جس کے نتیجے میں کچھوا اپنی اِجباری سستی کے باوجود معرکہ جیت گیا تھا، مقابلہ آج بھی کچھوے اور خرگوش کا سا ہے، لیکن معاملہ یہ ہے کہ کچھوا اپنی سست رفتاری کے ساتھ سو بھی رہا ہے اور خرگوش اپنی تیز رفتاری کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

اس کھوے کو گراں خوابی سے کون بیدار کرے گا......؟ مولانا علی میاں کے خیال میں یہ فریضہ ملت اسلامیہ پاکستان کو انجام دینا ہے...... مولانا علی میاں نے پاکستان کو تمام اسلامی دنیا کی روح قرار دیا اور کہا کہ عالم عرب اور اسلامی ممالک میں زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے...... اسلام کے عقائد پر ایک نیا یقین، ایک نیا اعتماد، ایک نیا ولولہ عمل، نئی جرأتِ اندیشہ، نئی لذتِ کردار اور ایک نیا جذبِ دروں پیدا کرنے کی ذمہ داری جسے ادا کرنے سے ''اونگھتی، سوتی آمادۂ زوال اور ڈگمگاتی قوموں کو نئی زندگی اور نیا جوش و خروش ملے، پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔''

پاکستان عالم اسلام کی فکری راہ نمائی کا ذمہ دار ہے۔ پاکستان جس نظریے کا داعی اور علم بردار ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ ملک دنیا بھر میں اس نظریہ حیات کے ماننے والوں کے لیے ایک فصیل اور مثال کا کام دے...... دنیا کے جس گوشے میں بھی اسلام اور مسلمانوں کو کوئی صدمہ پہنچے، ان کی نگاہیں پاکستان کی طرف اٹھیں اور کبھی نامراد نہ لوٹیں، ماضی میں جو مقام سلطنتِ عثمانیہ کو حاصل تھا، مولانا علی میاں بجا طور پر سمجھتے تھے کہ، اب وہی مقام پاکستان کو حاصل ہونا چاہیے۔ آج دنیا میں ایک بھی ایسا اسلامی ملک موجود نہیں جو مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے اپنا وزن ڈالے تو دنیا اس کا وزن محسوس کرے اور مسئلے کے حل پر مجبور ہو جائے...... مولانا علی میاں کے خیال میں یہ کردار پاکستان کو ادا کرنا چاہیے اور یہ مقام پاکستان کو حاصل ہونا چاہیے، لیکن پاکستان جن چند در چند مسائل اور مشکلات کا شکار رہا ہے، مولانا علی میاں ان سے بے خبر نہیں تھے، انھوں نے مختلف اوقات میں پاکستان کے مسائل کا جو تجزیہ پیش کیا، اس سے ان کی نگاہ میں پاکستان کے تین بڑے مسائل نمایاں ہوتے ہیں۔

تہذیبی تفاوت کا مسئلہ:

مختلف علاقوں کی تہذیبی اور لسانی ساخت کے پیدا کردہ مسائل جنھیں علاقائیت اور لسانیت کی خوردبینوں سے دیکھا جائے تو بہت بڑے ہیں اور ہر خطہ ان کی بنا پر اپنی الگ قومیت کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن یہ دعویٰ پاکستان کے اساسی نظریے سے روگردانی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کی اساس، تہذیب وتمدن اور زبان کے ایک بالکل مختلف نظریے کی بنا پر استوار ہے، مختلف لسانی گروہوں، تمدنوں اور علاقوں میں یگانگت پیدا کر دینے کا جو وصف یہ نظریہ رکھتا ہے اس میں دنیا کا کوئی دوسرا نظریہ اس کا ہم سر نہیں۔

مولانا علی میاں نے اس حوالے سے مکہ اور مدینہ کی خوب صورت مثال پیش کی ہے۔ کہ مکہ اور مدینہ جن کا نام عام سیرت نگاروں کی طرح ایک ہی سانس میں لیتے ہوئے انھیں ہم ایک ہی یونٹ تصور کرتے ہیں...... ایک یونٹ کا نام نہیں ہے، بلکہ دو مختلف تمدنوں کے حامل علاقوں کے نام ہیں جن کی بنیاد تہذیب یا معاشرت کی وحدت پر نہیں تھی۔ زبان کی وحدت تھی، مگر اس میں بھی لہجوں کا اتنا فرق تھا جو ایک کو دوسرے سے دور رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے...... اور پھر مدینہ والوں کے مقابلے میں اہلِ مکہ کا احساس برتری اور خود مدینہ میں اوس وخزرج قبائل کا دو الگ قوموں کی طرح معرکہ آرا ہونا، یہ تمام اختلافات اسلام کے اس تصورِ وحدت نے مٹا دیے جو بقول مولانا علی میاں اپنے اندر مقناطیسیت رکھتا ہے......

اسلام ارباب دنیا کے چھوٹے چھوٹے مقاصد سے جنم لینے والی چھوٹی وحدتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، اس کی دلچسپی صرف دو حقیقی وحدتوں سے ہے اور یہ دونوں دنیا کی بے ضرر ترین وحدتیں، ''وحدتِ انسانیت'' اور ''وحدتِ ایمان'' ہیں جن کے بعد تمام چھوٹی وحدتیں

بے معنی قرار پاتی ہیں۔

فروعی اختلافات کا مسئلہ:

مولانا علی میاں کا کہنا ہے کہ فروعی بحثیں علم اور ذہانت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں اور یہ ہمیشہ سے رہی ہیں، کیونکہ زندہ انسانوں میں ہمیشہ ہی اختلافات پیدا ہوا کرتے ہیں لیکن جب یہ فروعی بحثیں عوام کے سامنے آجائیں اور سیاسی رنگ اختیار کرلیں تو علم ونظر کو کشادہ کرنے والی یہی بحثیں مضر اور نقصان رساں بن جایا کرتی ہیں۔ علمی، فقہی اور کلامی مسئلے علما تک محدود رکھے جانے کی چیز ہیں، متاعِ کوچہ و بازار بنانے کی نہیں۔

گروہ بندیوں میں غلو کا مسئلہ:

جب فروعی مباحث کو پنپنے اور عوام میں رسوخ پانے کا موقع ملتا ہے تو ان کی بنیاد پر بھی ویسے ہی گروہ وجود میں آتے ہیں جیسے علاقوں اور زبانوں کی بنا پر وجود میں آیا کرتے ہیں...... یہی گروہ جدید عمرانیات کی زبان میں جماعتیں اور پارٹیاں بن گئے ہیں...... جماعتیں اور پارٹیاں، جو رفتہ رفتہ اپنا مقصد آپ بن جایا کرتی ہیں اور ملت کا اجتماعی مفاد پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ مولانا علی میاں نے اہلِ پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''میں نے ہندوستان میں مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر یہ بات کہی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملت کے مفاد کا تقاضا ہے کہ حرفِ غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے تو میرے اخلاص کا تقاضا ہوگا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کروں ۔ یہ وہ قربانی ہے جس کا سبق حضرت خالد بن ولید کی قربانی ہمیں دیتی ہے۔''

چنانچہ اس وقت علمائے امت کے کرنے کا کام امت کی صلاحیتوں کو متحد و مرتکز کر

کے اشاعت اور احیا کی سرگرمیوں کی طرف لانا ہے، موجودہ نازک اور عبوری دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا یہی طریقہ ہے۔

مسلمان اپنی تاریخ کے تناظر میں ایک بڑی قوم ہیں۔ عقیدے اور نظریے کی بڑائی بھی رکھتے ہیں، لیکن محض ماضی کا منوّر ہونا مستقبل کے فروزاں ہونے کی دلیل نہیں ہوا کرتا، تاریخ ہر گزرتے لمحے پر اپنا عمل جاری رکھتی ہے، دستِ قضا میں وہی قومیں صورتِ شمشیر رہا کرتی ہیں جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب کرتی ہوں...... مولانا علی میاں نے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا تھا کہ:

"اب اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کے صبر و تحمل میں اس کی بالکل گنجائش نہیں کہ کوئی دوسرا ملک سپین بنے۔"

اس خطرناک اندیشے سے بچنے کے لیے اہل پاکستان کو خیر کثیر...... یعنی حکمت کی طرف رجوع کرنا ہوگا...... حکمت سے مراد قرآن حکیم ہے، حدیث رسولؐ ہے، اچھی سمجھ بوجھ ہے...... سب کچھ ہے، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی تحقیق کے مطابق حکمت سے مراد اخلاق ہے...... اخلاق فاضلہ۔

معاشروں کے اخلاق بگڑتے ہیں تو ان کے مزاج بگڑ جاتے ہیں "فاسد الاخلاق" معاشروں کے مقابلے میں "فاسد المزاج" معاشروں کا علاج زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

خرابیِ مزاج کی ایک شکل اپنی جنت کو دوسروں کے ہاتھوں کی لکیروں میں تلاش کرنا بھی ہے...... جب قومیں اپنی جنت اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں تلاش کرنا سیکھ لیتی ہیں، اپنے فکر کی صلابت اور صداقت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں تو پھر ان پر کامیابیوں کے دریچے ہی نہیں، دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن قوموں میں یہ شعور کون پیدا کرتا ہے......؟

تعلیمی، تربیتی اور تحقیقی ادارے ہی وہ مراکز ہیں جہاں کی کارگاہوں میں نئی نسل کے انکار کی صورت پذیری ہوا کرتی ہے، لیکن یہ ادارے تو بے معنی ہیں، اگر انھیں نیا اور تازہ خون میسر نہ ہو...... وہ لوگ جو سچی علمی تحقیق کے جذبے سے سرشار ہوں، وہی ان اداروں کا نیا اور تازہ خون ہیں، لیکن وہ دور جب جذبہ، خیال، فکر، ہر شے فرد ختنی ہو، اس میں علم بھی جنسِ بازار بن جایا کرتا ہے پھر تحقیق کا وہی حال رہ جاتا ہے، جس کا نقشہ حضرت علامہ اقبال نے یوں کھینچا تھا:

شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملاّ کے غلام اے ساقی

دراصل علم و تحقیق کسی رسم کا نہیں، ایک رویّے کا نام ہے، یہ رویّہ بے لوثی اور بلندی چاہتا ہے، ریت کے کچے گھروندوں کو اپنے مسکن سمجھتے رہنے سے یہ رویّہ پیدا نہیں ہوتا، اس کے لیے تو سورہ کہف میں مذکور نوجوانوں جیسے جذبے، جرأت اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اس کے لیے زندگی کی نئی جہات کی تسخیر کے سفر پر روانہ ہونا ہوگا...... اس مقصد کے لیے مولانا علی میاں نے نوجوانوں کو اپنے اندر تین صفات پیدا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے:

۱۔ ان کا وجود دوسروں کے لیے نافع ہو۔
۲۔ طبیعت میں استغنا پیدا کیا جائے۔
۳۔ اپنے شعبہ علم میں صاحب کمال بنا جائے۔

ان سب پر مستزاد تزکیہ باطن ہے جو اگر میسر نہ ہو تو بقول علی میاں کتاب و حکمت بھی ناقص رہ جاتے ہیں۔

اگر نوجوانانِ ملت اس لائحہ عمل کو اختیار کرلیں تو اپنی شخصیت پر خارج کے مسلسل حملوں کے باوجود اپنے باطنی جوہر کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس لائحہ عمل کو اختیار کر لینے سے ہم علم کا رشتہ رب سے جوڑ سکتے ہیں۔ جب علم کا رشتہ خالق کے ساتھ استوار ہو جائے گا تو پھر ہم ایک واقعی اسلامی معاشرے کی تشکیل کر سکیں گے اور اسلامی عقیدے کی مظہر مملکت...... پاکستان کو، اسلامی تمدّن کا مظہر ملک بھی بنا سکیں گے۔

پاکستان کے حوالے سے یہی مولانا علی میاں کا خواب ہے:

ملالِ عالمیان دم بدم دگرگون است
منم کہ مدّتِ عمرم بہ یک ملال گزشت

(۲۰۰۰ء)

بلیچراغ
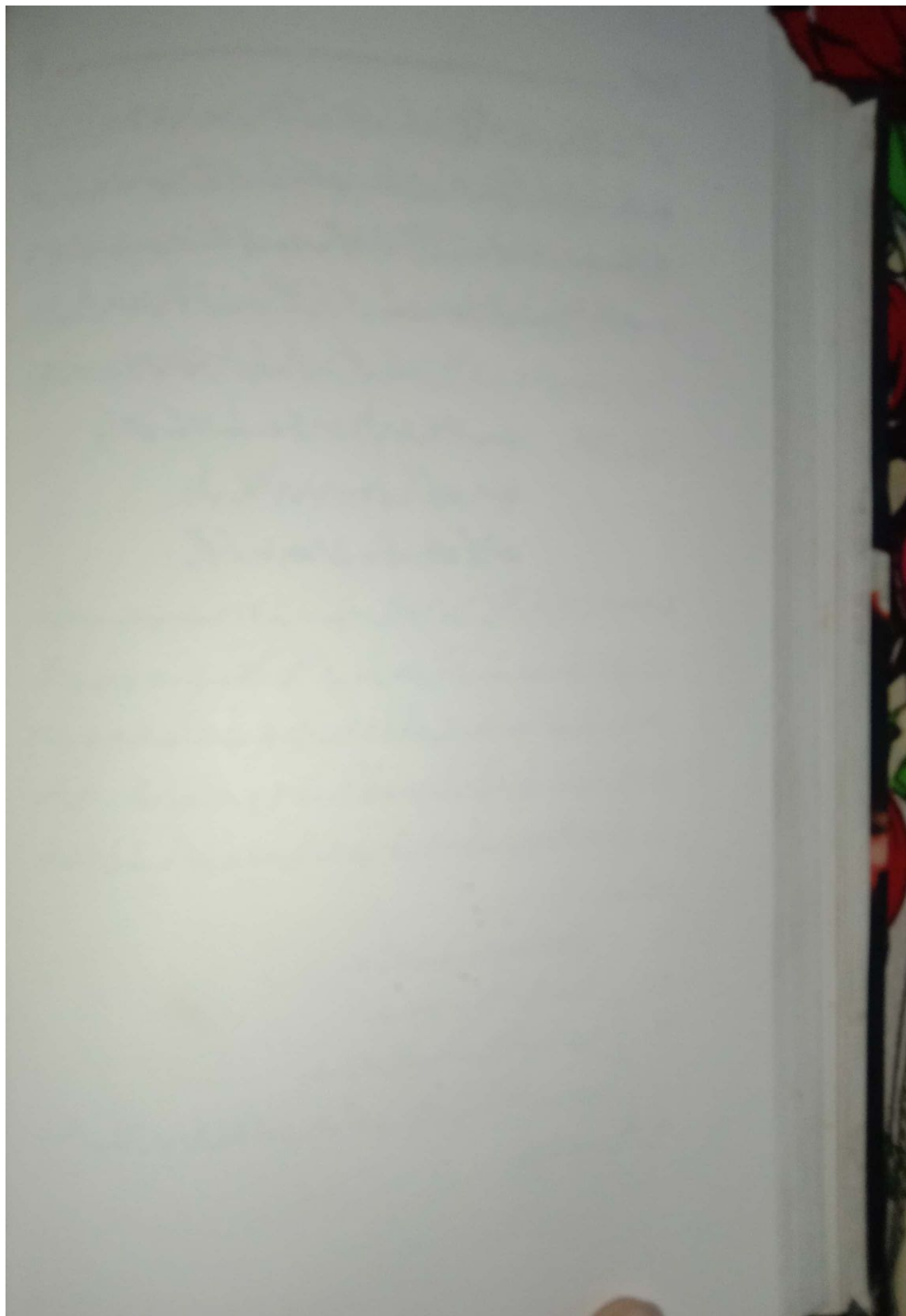
مطالعہء اقبال
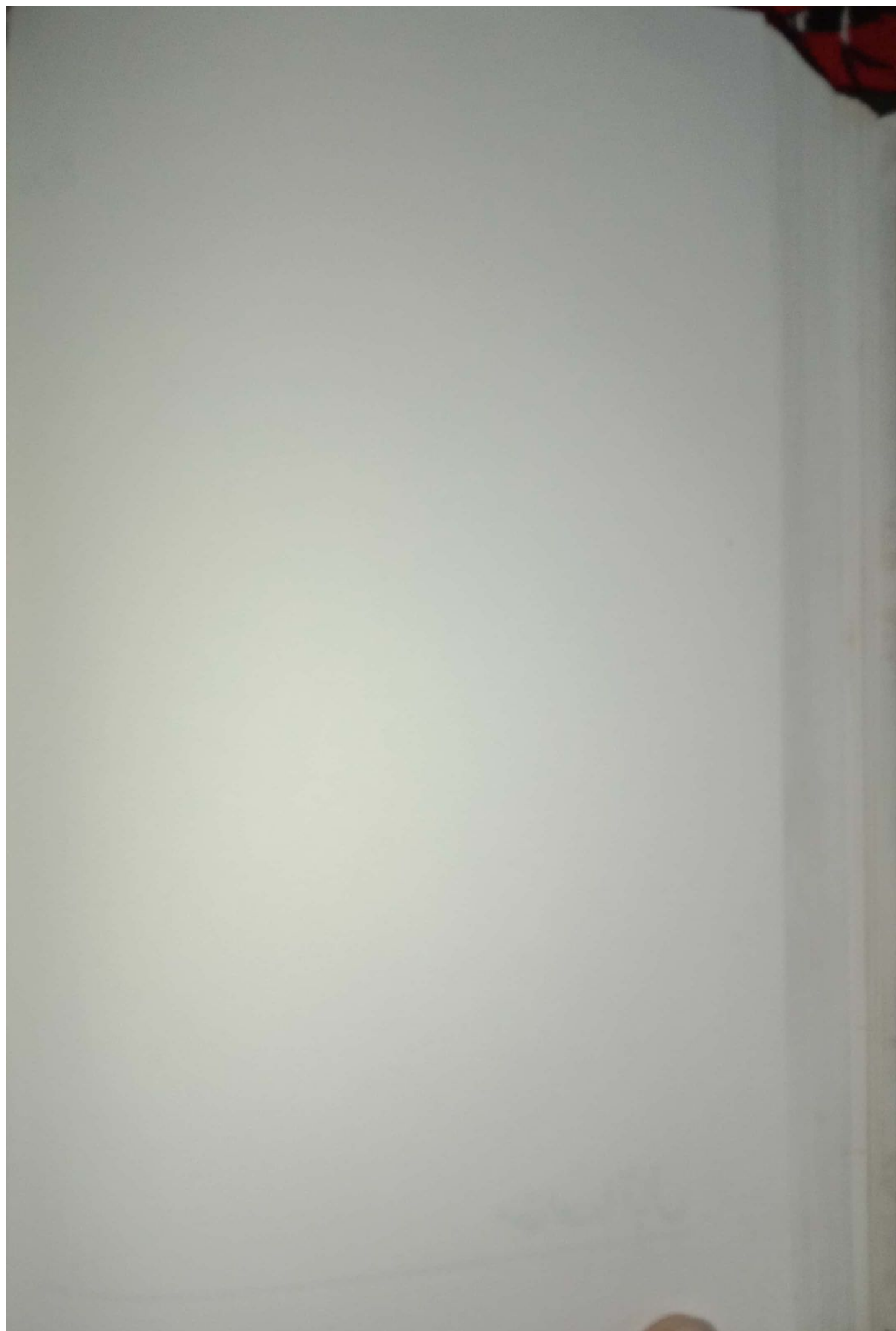
اقبال، آج کا فن کار اور مطالباتِ فن

انسان جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اپنے اردگرد پھیلے ہوئے ماحول سے اثرات قبول کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ماحول اور ماضی (ماحول بھی ماضی کا ایک اینٹی تھیسس ہی ہوتا ہے) سے اثر پذیری آگے چل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ انسان اگر اوائل عمر میں اپنے لیے، ماحول میں موجود کسی شخصیت کا بطور راہ نما انتخاب کر لے تو شخصیت کے تشکیلی مرحلوں کی بہت سی دشواریاں نفسی پیچیدگیاں بن جانے کی بجائے خوبصورت موڑ بن جاتی ہیں۔

ہمارے موجودہ معاشرے میں نسل نو کے بارے میں یہ خیال بہت عام اور پختہ ہے کہ اس میں 'صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے'...... لیکن ان صلاحیتوں کی تہذیب کے لیے جس کارگاہِ فکر کی ضرورت ہے......؟ اس کی جانب توجہ کرنے کا رواج ہمارے ماحول میں نہیں پایا جاتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ نوجوان جو بہت سی صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتے ہیں اول تو ان

صلاحیتوں کا عرفان ہی نہیں کر پاتے دوسرے یہ کہ انھیں ان صلاحیتوں کی تہذیب وتزئین اور صدرت گری کے لیے کسی راہ نما کا سراغ نہیں ملتا۔

ہم آج کی صحبت میں اپنے ان نو جوان دوستوں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرر ہے ہیں جو کسی فن کی صلاحیت سے متصف ہیں۔فن سے مراد فکر وخیال اور قوت وعمل سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی رجحان ہے۔جس کی تہذیب اسے فن یا آرٹ بناتی ہے۔

یوں تو مسلم تاریخ میں متعدد شخصیات موجود ہیں، جن کے تصوراتِ فن، تعلیمات اور افکار کی طرف توجہ زندگی کے تشکیلی مرحلوں میں راہ نمائی فراہم کرسکتی ہے لیکن انسانی طبیعت بالعموم زمانی اعتبار سے قریب تر مثال سے زیادہ مانوس ہوا کرتی ہے، اس لیے ہم اس بات کو اپنی ایک قومی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ ہمارے ماحول میں ایک ایسا نام زندہ ہے جو مختلف علوم وفنون کا جامع ہے اور جس کے افکار ونظریات نہ صرف نو جوانوں کے لیے بلکہ من حیث القوم بھی ہم سب کے لیے ایک عمدہ راہِ عمل مہیّا کر تے ہیں۔

اقبال...... یوں تو ایک شخصیت تھے لیکن ایک ایسی ہمہ گیر شخصت جس کے سلسلہ ہائے فکر، شعروخیال کے دائروں سے نکل کر ایک طرف تو فلسفہ وتفکر کا نظام قائم کرتے ہیں تو دوسری طرف مختلف علوم وفنون کی حد بندیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اقبال ایک ''کہکشاں'' (Galaxy) ہیں جس سے شعروادب تفلسف و مذہب اور فن وفکر کی کئی شعاعیں منزلوں کو منور کرتی ہیں۔اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر آج کا نو جوان اپنے ماحول سے اقبال کا انتخاب کر لے تو اسے منزلوں کا سراغ پانے میں آسانی ہوسکتی ہے۔

فن کے حامل اصحاب کو اقبال کے تصورِفن سے اکتسابِ فیض اپنی اپنی راہوں پہ منزلوں آگے بڑھا سکتا ہے آیئے آج کی صحبت میں اس کہکشاں سے اکتسابِ نور کی کوشش کر تے ہیں۔اس مقصد

کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اقبال کے نزدیک فن کا ظہور کیسے ممکن ہے.....؟

اقبال کے خیال میں ''انسان زمان و مکان کے ارتقا کے عمل میں شریک فاعل ہے، آزاد ہے، خالق ہے اپنی خودی کے اثبات ونشو ونما کے وسیلے سے نفسِ لامحدود سے رشتہ قائم کرتا ہے'' (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)

اقبال، زمان ومکان کے ارتقائی عمل میں انسان کی فعّالیت کے استحکام، خلّاقی کی بقا اور خودی کے اثبات کے لیے عشق کو لازم قرار دیتے ہیں وہ دنیا کے عظیم فن پاروں کو فنکاروں کے اپنے فن سے عشق کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ عشق ان کی اصطلاحات میں وجدان اور تخلیقی قوت دونوں کی جامع اصطلاح ہے۔ اسے اقبال دمِ جبرئیل اور دمِ مصطفیٰ قرار دیتے ہیں۔ عشق کامل ہو جائے تو آدم گری ممکن ہو جاتی ہے اور اسے برتری زیب دینے لگتی ہے۔

تاج محل کے حسن کا راز دریافت کرتے ہوئے اقبال نے کہا۔

عشقِ مردان پاک و رنگین چون بہشت
می کشاید نغمہ ہا از سنگ و خشت

مسجد قرطبہ ایسے عظیم فن پارے پر اتنا ہی بڑا فن پارہ تخلیق کرتے ہوئے بھی اقبال نے اس کی نہاد میں عشق کو موج زن دیکھا۔

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

عشق، عام لغت میں ایک پامال لفظ ہے لیکن اگر کائنات کے کلیدی لفظوں کی جستجوں کی جائے تو شاید یہی پامال لفظ سرِ فہرست ہوگا۔ عشق کا اوّلین مطالبہ ''خون جگر'' ہے۔

فن کار سے عشق، پہلے قدم پر ''مجنون'' ہو جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اقبال اس حقیقت سے خوب آگاہ ہیں ان کا تصوّرِ فن اپنی اساسی جہت میں خونِ جگر کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

میر نے کہا تھا ''مصرعہ کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں + کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں'' اقبال نے کہا۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال کے نظامِ فکر میں خودی کا تصوّر کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال فن اور فنکار کے لیے خودی کے جوہر کو لابدّی قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ استحکامِ خودی سے فن کے نادر نمونے وجود میں آتے ہیں ''ضربِ کلیم'' کی نظم ''دین و ہنر'' میں کہتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

اقبال مایوسی رقنوطیت اور افسردگی کے خلاف ہیں۔ اقبال ان تمام کو خودی سے محرومی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ انھیں عجمی لٹریچر پر بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس میں خودی کا جوہر نہیں ہے۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دلآویز

اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں

بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

عشق اور خودی کی منزلیں پا لینے والا فنکار الہامی رفعت کی منزل پاتا ہے۔ الہامی صلاحیت فن کار کے باطن کے گداز اور اس کی سلامتیِ طبع کے تحفظ سے ممکن ہے اگر فن کار معاشرے کے غیر صحت مندانہ رجحانات میں گم ہو کر باطن کا گداز اور فطرت کی عطا کردہ سلیم الطبعی سے عاری ہو جائے تو الہامی صلاحیت ممکن ہی نہیں رہتی۔ ان منفی رجحانات سے بچ کر الہامی صلاحیت پا لینے والے فن کار کا فن اجتہاد کا نمونہ ہو سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

''کسی قوم کی روحانی صحت کا دارومدار اس کے شعرا اور آرٹسٹ (فن کار) کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے''

یہ الہامی حوالہ فن کے اجتماعی پہلو کو دائرہ بحث میں لاتا ہے۔ اقبال فن کو زندگی سے غیر منفک طور پر مربوط قرار دیتے ہیں اور زندگی سے ہٹ کر کسی فن کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اجتماعی یا انفرادی بحث کا رخ جو بھی ہو دونوں پہلوؤں سے الہامی صلاحیت کے لیے فنکار کا دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنا لازم قرار پاتا ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے

افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے

خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے

ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے

دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

اپنی نظر سے زمانے کو دیکھنے کا تجربہ الہامی صلاحیت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور الہامی صلاحیت یقین واعتماد کی دولت عطا کرتی ہے۔ یقین واعتماد کی دولت جس سے سرشاری کسی بھی تخلیق کے لیے شرطِ اوّلین ہے۔ یقین تخلیق کے لیے زندگی ہے اور بے یقینی موت اقبال نے کہا۔

بی یقین را لذّتِ تحقیق نیست
بی یقین را قوّتِ تخلیق نیست
بی یقین را رعشہ ہا اندر دل است
نقشِ نو آوردن او را مشکل است

جب کوئی فن کاران خصائص کو پالیتا ہے تو پھر اس کے ہاں سچا فن جنم لیتا ہے۔ ظاہر پرستی، کم کوشی، جاہ طلبی، سہل پسندی اس راہ کی بڑی رکاوٹیں ہیں جب کہ خودی، عشق، الہامی صلاحیت اور یقین واعتماد...... فن کار میں قوّت وشوکت کا احساس پیدا کرتے ہیں اور دنیا کا کوئی بڑا فن پارہ قوّت وشوکت سے خالی نہیں۔ فن پارہ جہاں جمال آگیں منظر پیش کرتا ہے وہاں اس کی بنیاد میں جلال بھی پوشیدہ ہوتا ہے، دراصل یہ پوشیدہ جلال ہی اسے دوام عطا کرتا ہے۔ جلال، فطرت پر انسان کے غلبے کا اثبات کرتا ہے اور اقبال کے نزدیک انسان فطرت میں رہ جانے والی کمیوں کو پورا کرتا ہے۔
مسجد قوّت الاسلام کو دیکھ کر اقبال نے کہا تھا؛

''میرے دل پر اس کی شوکت کی ایسی ہیبت طاری ہوگئی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں''۔

اہرام مصر سے متعلق اشعار میں کہتے ہیں ؎

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیّت کی یہ تصویر

اقبال کے نزدیک وہ فن جس میں قوت وشوکت نہیں وقت کے سینے کو چیر کر دوام پانے کی صلاحیت نہیں رکھتا دلبری بے قاہری جادوگری ہے اور با قاہری پیغمبری، یہی قوت وشوکت پژمردگی اور مایوسی سے نجات دلاتی ہے، زندگی میں توازن پیدا کرتی ہے، فن کے مذکورہ بالا معیار زندگی میں حرکت پیدا کرتے ہیں اور فرد سے آگے بڑھ کر اجتماعی وجدان کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ ایسا فن ہی حیات آفرینی کی صلاحیت رکھتا ہے اقبال کے مطابق:

> ''تمام انسانی جدو جہد کا انجام فقط حیات ہے اور تمام انسانی علوم وفنون اس مقصد کے حصول کے تابع ہیں اس لیے ہر علم وفن کی منفعت کا اندازہ اس کی حیات آفریں قوت ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ ترین فن وہ ہے جو ہماری طبیعی قوتِ ارادی کو بیدار کرے اور ہمیں مصافِ زندگی میں مردانگی سے مقابلہ کرنے کی طاقت بخشے''

یہی ''اعلیٰ ترین فن''، نفس لامحدود سے انسان کا رشتہ قائم کرتا ہے، نفس لامحدود سے صوفی بھی رشتہ قائم کرتا ہے اور نبی بھی۔ نفسِ لامحدود سے رشتہ کی یہ بحث فنکار کے حوالے سے بھی اہم ہے اس سے ذہن نبی، صوفی اور فنکار کے تجربے کی یکسانیت یا

مغائرت کے سوال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اقبال نے اس سوال کا جواب حضرت عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمتہ کی بیان کردہ ایک خوبصورت تمثیل سے فراہم کیا ہے کہ صوفی اگر معراج پر جائے تو وہ واپسی کا خواہاں نہیں ہوگا جب کہ نبی معراج سے واپس آتا ہے۔ اقبال نے انسانی فن کو اس بلند پایہ مثال سے سمجھنے کی کوشش کی ہے جو بجائے خود اس کے ذہن میں فن کی عظمت کے احساس کا پتہ دیتی ہے۔ اقبال کے خیال میں فن کار کا تخلیقی تجربہ بنیادی طور پر مذہبی تجربے سے مماثل ہے اس لیے فنکار ایک پست سطح پر پیام بر کے درجے پر فائز ہوتا ہے جو اپنے تجربے سے خلق کو آگاہ بھی کرتا ہے۔

(۱۹۹۳ء)

عصرِ حاضر کے مسائل اور فکرِ اقبال

کسی بھی مفکر کے نظامِ فکر کو معروضی حالات و مسائل پر منطبق کرتے ہوئے دو باتوں کو دائرۂ خیال میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے:-

۱۔ یہ کہ زمانی اور جغرافیائی اعتبار سے معروضی حالات کے ساتھ مفکر کے ربط کی نوعیت کیا ہے......؟

۲۔ اس مفکر کی فِکر اپنے عہد سے ہٹ کر کس حد تک تازہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے......؟

خوش قسمتی سے علامہ اقبال کے ضمن میں ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ فِکرِ اقبال پر گفتگو کے لیے نہایت مثبت اور مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جہاں تک ہمارے آج کے مسائل و معاملات کی نوعیت کا تعلق ہے تو یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ کم و بیش آج بھی وہی ہیں جو گزشتہ صدی میں تھے۔ حالات و واقعات کے ضمن میں یہ تبدیلی ضرور آئی ہے کہ سنین

بدل چکے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے تبدیلیاں آچکی ہیں، چہرے بدل چکے ہیں مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ بحیثیت قوم ہمارے منظر نامے میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آئی ہے، غلامی کی بدلتی ہوئی صورتوں نے اگرچہ ان کے ظاہر کو ضرور تبدیل کیا ہے……؟ سیاسی سطح پر آزادی کے حصول کے بعد سے ہم نے ملی نشو و نما کا سفر جس رفتار سے طے کیا ہے وہ کسی بھی طرح قابلِ رشک نہیں کہلا سکتا اور پھر سیاسی آزادی کے علی الرغم معاشی، سماجی، ثقافتی اور جغرافیائی جکڑ بندیوں کے جن سلاسل میں آج ہم اسیر ہیں کیا ان کی شدت ایامِ غلامی سے کم ہے……؟

جدید دنیا میں ترقی کی سمت کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے کی صدیوں کی ترقی ایک رجعتِ قہقہری کے ساتھ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے دور میں واپس لے جائی جا چکی ہے، انصاف مساوات اور عدل محض چند الفاظ بن کر رہ گئے ہیں۔ عالمِ اسلام کی کمر تازیانوں پر تازیانے کھانے کے بعد بھی مزید تازیانوں کے لیے آمادہ ہے۔…… پے در پے المیوں کے بعد بھی اجتماعی احساس کی خوابناکی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ ہسپانیہ پر خونِ عرب کے حق کی بات تو دور رہی، یہاں ترقی پذیر دنیا جینے کے حق سے بھی محروم کی جا رہی ہے دنیا، انسانیت کے خون سے لالہ زار ہے اور عالمِ انسانیت (عالمِ اسلام بھی جس کا ایک حصہ ہے) مہر بلب۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیاد کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

انسانیت کا لہو مانندِ آب ارزاں ہو چکا تاہم ہر دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں رہتا ہے...... کسی نئے اقبال کے ظہور تک یہ دور اقبال ہی کا دور ہے اس لیے عصری مسائل کی تفہیم اور گرہ کشائی کے لیے افکارِ اقبال کی جانب دیکھنا ایک مناسب عمل ہوگا:

ہمارے اوپر نشان زد کئے گئے پہلے نکتے کا جواب یہ ہوگا کہ اقبال نے جس دور میں آنکھ کھولی تھی، زمانے کی ڈور میں کتنی ہی گرہیں لگ جانے کے باوجود اس دور کے مسئلے ابھی تک لاینحل پڑے ہیں اور ان میں متعدد بہ اضافے ہو چکے ہیں۔

ثانیاً: کسی مفکر کی فِکر کو اس کے بعد کے زمانے پر منطبق کرنے کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس مفکر کی فِکر میں زمانی تغیر کے ساتھ تازگی کا گراف کیا ہے......؟ اقبال کے باب میں اس بات کے اظہار پر تردد نہیں ہونا چاہیے کہ اقبال کی فِکر آج بھی تروتازہ ہے اور گزشتہ صدی میں جس تیزی کے ساتھ علامہ اقبال کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے وہ شاید عصر حاضر کے کسی اور مفکر کو نصیب نہیں ہوا اور محض مقبولیت ہی تازگی کی دلیل نہیں بلکہ فی الواقع فکرِ اقبال میں وہ توانائی ہے جو اسے زندہ رکھے ہوئے ہے اور آئندہ بھی زندہ رکھے گی۔

نصف صدی پیشتر اقبال نے ایک الگ مسلم ریاست کو مسلمانانِ برصغیر کے مسائل کا حل بتایا تھا آج جب پاکستان مسائل و معاملات کی دلدلوں میں گھرا ہوا ہے تو یہ ایک معقول رویہ ہے کہ ہم پھر اقبال کی طرف رجوع کریں اور یہ دیکھیں کہ اقبال کی فِکر آج کے پُرپیچ اور تہہ در تہہ مسائل کی گرہ کشائی میں کس صورت معاون ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے مسائل کے ضمن میں اقبال کا تجویز کردہ حل درست تھا اور حقیقت بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو پاکستان............ ایک ایسے خطہ زمین کی خواہش کے نتیجے میں بنا تھا جو اسلام کے ابدی اصولوں کا مظہر بن کر عالمِ انسانیت کے لیے راہ نما کا

کردار ادا کرے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان آج بھی مسلمانانِ عالم کے مسائل کا حل فراہم کرسکتا ہے ایسا پاکستان جو مستحکم، مضبوط، غیر جانبدار اور خوشحال ہو۔ ایک مضبوط و مستحکم پاکستان ہی ملتِ اسلامیہ کا قلعہ ثابت ہوسکتا ہے، ملتِ اسلامیہ، جس کی سربلندی کے لیے اقبال ''سوز و سازِ رومی'' اور ''پیچ و تابِ رازی'' کے مراحل سے گزرے تھے، آج رسوائیوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ اقبال نے اس ادبار کا علاج، انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں استحکام کو قرار دیا تھا آج جب ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو یہ دل خراش حقیقت سامنے آتی ہے کہ فی الواقع ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم آج تک انفرادی اور اجتماعی سطح پر مستحکم نہیں ہو پائے۔ اگر ہم انفرادی اور اجتماعی سطح کا استحکام حاصل کرلیں تو ہمارے نصف سے زائد مسائل خود بخود حل ہو جائیں، حصولِ استحکام کی بنیاد یقین ہے، اقبال نے اپنے مغلوبِ گماں مخاطب کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔ اس استحکام کے حصول کے بعد اقوام میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ باقی آدھے مسائل وہ اپنے زورِ بازو سے حل کرلیا کرتی ہیں۔

یہ فکرِ اقبال کا ایک پہلو ہے، جس کا تعلق اس خطے سے ہے، جس میں اقبال نے جنم لیا تھا، فکرِ اقبال کا دوسرا پہلو اس سے برتر ہے، جس کا تعلق بنی نوعِ انسان سے ہے اقبال دراصل بنی نوعِ انسان کے مفکر ہیں بالکل ایسے جیسے اسلام بنی نوعِ انسان کا دین ہے۔ اسلام اور عالمِ اسلام اس لیے اہم ہیں کہ یہ بنی نوعِ انسان کا ایک حصہ ہیں، نہایت اہم حصہ۔ اسلامیانِ برصغیر اقبال کے قریب ترین مخاطب تھے ان سے خطاب دراصل انسانیت ہی سے خطاب ہے۔ اقبال کی فکر کے اس پہلو کو میں اقبال ہی کی تین الگ الگ اصطلاحوں کے تحت بیان کرنا چاہتا ہوں:۔

۱۔ تخلیقی قوت پر انحصار

تخلیقی قوت خواہ افراد کی ہو یا معاشرے کی، انسانی زندگی میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے، اقبال اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں، انھوں نے اپنے افکار میں نظم و نثر کے ذریعے فرد کی تخلیقی قوت پر بہت زور دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ''انسان کی تخلیقی قوت پر انحصار کیا جائے صرف انسان کی تخلیقی قوت اور قوتِ عمل پر یقین رکھنے سے مسلمان دوبارہ نمو پا سکتے ہیں اور پھول پھل سکتے ہیں۔'' اقبال کے نزدیک انسان ، دوسرے موجودات سے اسی لیے مختلف ہے کہ وہ ایک تخلیقی جوہر لے کر دنیا میں آیا ہے، اس کی یہی تخلیقیت اسے کائنات کے منظرنامے میں اعتبار اور وقار عطا کرتی ہے

فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازین کردند

۲۔ احترام انسانیت

معاشرتی افراتفری اور ابتذال کا بنیادی سبب انسانیت اور انسانی قدروں سے بے توجہی ہے۔ انسان کا احترام ختم ہو رہا ہے۔ مادیت پرستی اور منفعت کے حصول کی خواہش نے انسانوں کے باہمی رشتے کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے۔ اقبال نے یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو سالِ نو کا پیغام دیتے ہوئے کہا تھا:

''انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک عام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔''

احترامِ انسانیت کے درس کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال نے مزید کہا:

''جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹایا نہ جائے گا اس وقت تک دنیا میں انسان سعادت وفلاح کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔''

۱۹۳۵ء میں اقبال نے انسانی قدروں کے جس زوال کی نشان دہی کی تھی، اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے امتیازات قوم پرستی اور ملوکیت کی تاریکیاں آج بھی اسی طرح چھائی ہوئی ہیں بلکہ شاید اب ان میں پہلے سے زیادہ تسلسل آچکا ہے۔ ایسے میں اقبال کا پیغام ہمارے لیے صرف راہِ عمل مہیا نہیں کرتا بلکہ ایک تازیانۂ عبرت بھی ہے کہ ہم نے اپنے مفکر کی آواز سے کس درجہ بے اعتنائی اختیار کیے رکھی ہے۔

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

۳۔ مربوط اور متناسب عمرانی نظام

یوں تو ہر دور میں معاشرتی توازن قوموں کی زندگی کا لازمی عنصر رہا ہے مگر موجودہ سماجی پس منظر، اکھاڑ پچھاڑ اور معاشرتی عدم توازن کے دور میں ایک مربوط عمرانی نظام کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے، اقبال نے نہ صرف اپنے دور میں اس چیز کا احساس کر لیا تھا بلکہ مذہب کے حوالے سے اس شے کو مستقبل کے اعتبار سے بھی بیان کر دیا تھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ زندگی کی سطح اچھل کر بلند نہیں ہوتی بلکہ اس کی ترقی ایک طویل ارتقائی عمل کا حصہ ہوتی ہے جس کے مختلف مراحل پر نظر رکھنا از بس ضروری ہے، اسی لیے انھوں نے کہا ہے کہ مذہب کی اصل غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط

اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔

اگران تینوں نکات پر ٹھنڈے دل سے غور و تدبر کرتے ہوئے انفرادی واجتماعی زندگی کی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی طرح ڈالی جائے تو نہ صرف یہ کہ عصرِ حاضر کی فکری دلدلوں سے رہائی ممکن ہو سکتی ہے بلکہ اقبال کے اس شکوے کا بھی مداوا ہو سکتا ہے:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات

(۱۹۸۹ء)
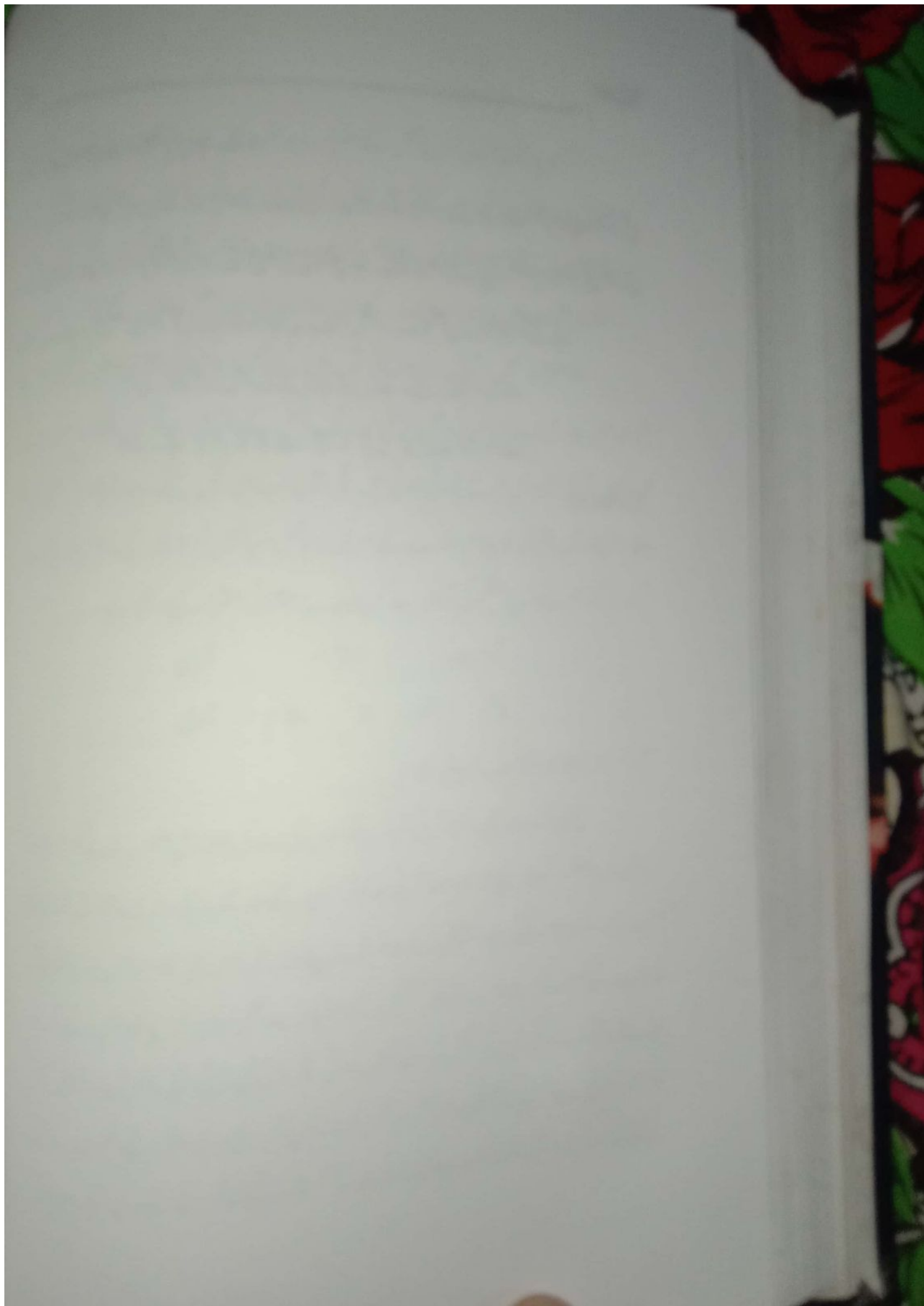
اِسلام کا انقلابی تصوّر اور اِقبال

فکری جمود کے جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس میں جب کوئی مصنف ایسے مباحث چھیڑتا ہے، جن کا تعلق قوم کی فکری وروحانی زندگی سے ہو تو بے ساختہ غزل چھڑ جانے کے احساس سے طلبِ ساز کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ان بزرگوں میں ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف ملی مسائل پر اپنے مخصوص زاویہء نگاہ کے ساتھ اظہارِ خیال فرماتے رہتے ہیں۔ آج کل ایک قومی اخبار میں ان کا کالم بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور کی اشاعت ۲۷/نومبر ۱۹۹۲ء میں ''اسلام کا انقلابی تصور اور اس سے انحراف کی راہیں'' کے زیرِ عنوان ان کی جو تحریر شائع ہوئی اس میں انھوں نے علاوہ دیگر مباحث کے اسلام کے اجتماعی فکر اور حرکی تصورات کی تجدید واحیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ اوّلین اور اہم ترین کام بحمد اللہ بتمام وکمال علامہ اقبال اور بعض دوسرے مفکرین اور

مصنفین کے ہاتھوں انجام پا چکا ہے اور یہ کہ:

"ایمانی حقائق کا اثبات بھی عہدِ حاضر کی فکری سطح اور اعلیٰ ریاضی وطبیعیات اور اعلیٰ نفسیات کی اساس پر علامہ کے خطبات کے ذریعے ہو چکا ہے اور اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت بھی اقبال کے اشعار اور دوسرے حضرات کی تصانیف کے ذریعے ہو چکی ہے"۔

میں ڈاکٹر صاحب کے دیگر افکار سے قطع نظر صرف منقولہ اقتباس کے حوالے سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کی آواز اس عہد کی سب سے بڑی آواز ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اقبال کی کارگاہِ فکر میں جو انجم ڈھلے وہ کسی اور مفکر کے ہاں بار ہی نہیں پا سکے یا اگر زیرِ بحث آئے ہیں تو ان کی وہ صورت گری نہیں ہو سکی جو اقبال کے ہاں نظر آتی ہے لیکن اقبال نے اپنی نظم اور نثر کے ذریعے بنیادی فکری مسائل کو چھیڑا اور گراں قدر افکار پیش کیے، وہ ان مسائل پر مختلف اصحابِ فکر کو یکجا کر کے عملی خاکوں کی تشکیل کے خواہاں تھے ہماری بدقسمتی کہ زندگی نے اقبال کو مہلت نہ دی اور ان کی یہ خواہش پوری ہونے سے رہ گئی۔

اقبال کے رخصت ہو جانے کے بعد پھر کسی اور طرف سے اس ضرورت کو پورا نہیں کیا گیا۔ مختلف مذہبی و مسلکی تحریکات نے اپنے اپنے طور پر اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اہم کام کیے، لیکن اب تک عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لیے اسلامی تعلیمات کے ماڈل پیش نہیں کیے گئے۔ زندگی کے نو بہ نو تقاضوں اور عالمی صورتِ حال کے تناظر میں اگر کوئی واقعی اسلامی مملکت موجود ہو تو وہ سیاست، اقتصادیات، نشریات، خارجہ امور، فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں کن خطوط پر کام کرے گی، یہ سوال اب تک

سوال ہی ہے۔

جذباتی اور اصولی باتیں تو سب کرتے ہیں لیکن عملی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر سسٹم کی تشکیل کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ خیال کہ جب ایسی حکومت قائم ہوگی تو اس وقت ماڈل سامنے آئے گا۔ کوئی ایسا پختہ یا تسلیم کیے جانے کے قابل خیال نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہوم ورک کے بغیر حکومتیں تشکیل پاتی ہیں تو وہ پہلے سے موجود مشینری میں فٹ ہو کر رہ جاتی ہیں، بے دست و پائی کی یہ کیفیت انھیں نہ آگے بڑھنے کا موقع دیتی ہے نہ پیچھے ہٹنے کا۔

اس لیے ہمارے خیال میں ضروری بات یہ ہے کہ جس عارضی دور میں ہم سانس لے رہے ہیں اس میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مختلف شعبہ ہائے حیات کے لیے نظمِ حکومت کے ماڈل پیش کیے جائیں۔ ظاہر ہے یہ ماڈل خالص علمی تحقیق کی بنا پر استوار ہوں گے۔ اگر ہم یہ خیال کر لیں گے کہ یہ کام انجام پا چکا ہے تو شاید ہم اسلام کے اجتماعی فکر اور حرکی تصورات کی عملی برکات سے محروم ہی رہ جائیں۔

رہی دوسری بات کہ ایمانی حقائق کا اثبات بھی عہدِ حاضر کی فکری سطح اور ''اعلیٰ ریاضی''، طبیعیات اور ''اعلیٰ نفسیات'' کی اساس پر علامہ کے خطبات کے ذریعے ہو چکا ہے، تو اس ضمن میں دو باتیں بطورِ خاص قابلِ توجہ ہیں:

ایک تو یہ کہ اقبال کی عظمت و جلالت کو تسلیم کیے جانے کے باوجود اب تک ہمارے ہاں خطبات کی تفہیم کا دائرہ حد درجہ محدود رہا ہے۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں ایک تو ان خطبات کا انگریزی زبان میں ہونا، دوسرے کسی عام فہم ترجمے کی کمی، تیسرے ہماری اجتماعی آسان کوشی...... نتیجہ یہ کہ خطبات اقبال ایک مقدس کتاب کی طرح سر آنکھوں پر تو رکھے

گئے ہیں لیکن انھیں کھول کر پڑھنے کی زحمت کم ہی کی گئی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اقبال سے منسوب مختلف اداروں خصوصاً اقبال اکیڈمی نے دنیا کی مختلف زبانوں میں ان خطبات کے تراجم کا اہتمام کیا ہے، جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۷ء تک کے دوران میں شائع ہو چکے ہیں لیکن بجائے خود اُردو میں ان خطبات کی تسہیل کی جانب توجہ نہیں کی گئی۔ خطبات کے اُردو ترجمہ کی کس قدر ضرورت ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بقول سیّد نذیر نیازی ترجمے کا خیال خود حضرت علامہ کے ذہن میں شروع ہی سے موجود تھا اور ۱۹۳۰ء میں جب خطبات کا پہلا ایڈیشن Six Lectures on Reconstruction of Religious thought in Islam. کے نام سے شائع ہوا تو حضرت علامہ نے سیّد نذیر نیازی کو لکھا کہ وہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین (استاد فلسفہ/مشہور عالم) سے ملیں اور اُن سے ترجمے کی ذمہ داری لینے کے متعلق دریافت کریں پھر جب ڈاکٹر عابد حسین مرحوم نے اپنی مصروفیت کے باعث معذوری ظاہر کی تو حضرت علامہ نے یہ کام سیّد نذیر نیازی کے سپرد کیا اور اپنی نگرانی میں ترجمے کا آغاز کروایا جو افسوس کہ علامہ کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا۔

سیّد نذیر نیازی نے بعد ازاں اس ترجمے کو مکمل کیا، ترجمے کے ضمن میں حضرت علامہ کی خواہش تھی کہ

"جو حضرات انگریزی زبان سے ناواقف یا جدید فلسفہ سے نا آشنا ہیں انھیں خطبات کا مطلب سمجھنے میں دشواری نہیں ہونی چاہیے"۔

نیز علامہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ترجمے کے اجزا اشاعت سے پہلے مختلف علما کی نظر سے بھی گزریں.....

کاش حضرت علامہ کو مہلت ملتی اور وہ یہ کام اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی

میں انجام تک پہنچوا دیتے لیکن تقدیر کا فیصلہ ہماری اس خواہش کے برعکس تھا۔ سیّد نذیر نیازی کا ترجمہ (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ) اور خطبات کے سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی (خطباتِ اقبال پر ایک نظر) شریف بقا (خطباتِ اقبال پر ایک نظر) ڈاکٹر سیّد عبداللہ (متعلقات خطبات اقبال) پروفیسر عثمان (فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (تسہیلِ خطباتِ اقبال) اور پاکستان سٹڈی سنٹر کراچی (اقبال فکر اسلامی کی تشکیلِ نو) کی مساعی اپنی اپنی جگہ قابل قدر لیکن اس اہم ترین کتاب کے فروغ اور تفہیم کے لیے ناکافی ہیں اور اکثر تو شایانِ شان بھی نہیں۔

خطبات کے حوالے سے اب تک جو اہم ترین کام سامنے آیا ہے وہ پروفیسر سعید شیخ کے حواشی اور تعلیقات ہیں جو ۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈمی اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئے، یہ خالص علمی و تحقیقی نوعیت کا قابلِ قدر کام ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ خطبات کے مافیہ اور پس منظر کے حوالے سے وسیع لٹریچر تیار کیا جاتا اور اُردو میں ان کے عمدہ تراجم کے ساتھ ان کی تسہیل پر مبنی کتابیں لکھی جاتیں۔

افسوس کہ ہمارے علمی اداروں اور انجمنوں نے اس جانب اب تک کما حقہ، توجہ نہیں کی، راقم الحروف نے ایک ملاقات (سرگودھا) میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خدمت میں بھی یہی گزارش کی تھی کہ وہ خطباتِ اقبال کی تسہیل کی جانب توجہ دیں انھوں نے فرمایا کہ ہم نے اس ضمن میں سیّد نذیر نیازی صاحب سے بات کی تھی لیکن انھیں زندگی نے مہلت نہ دی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا تھا کہ جیسے آپ نے چند برس ادھر اپنی کتاب استحکامِ پاکستان کے سلسلہ میں مختلف اصحابِ فکر و دانش کو بلا کر اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی، اسی طرح خطباتِ اقبال کے حوالے سے اب بھی مذاکروں اور جائزوں کی

ضرورت ہے۔

یہ مذاکرے خطباتِ اقبال کی تفہیم کے حوالے سے بہت ضروری ہیں اگر اعلیٰ درجے کے امتحانات (مثلاً فوق لیسانس اور مقابلوں کے امتحانات) کے لیے خطباتِ اقبال کے کچھ حصے نصاب میں شامل کر دیئے جائیں تو اس سے بھی اقبال کا یہ محروم توجہ پیغام کسی حد تک نئی نسل کے کانوں تک پہنچ سکے گا...... اگرچہ ''شعر مرا بمدرسہ کہ برد'' کے مصداق نصابات میں شامل ہونے سے کتابوں کی وقعت بڑھتی تو نہیں تاہم اس سے اتنا تو ہو گا کہ اس صدی کی ایک اہم دستاویز سے نئی نسل آشنا ہو جائے گی۔ تاہم یہ تجویز اس مسئلے کا حل نہیں ہے جس کی طرف ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں، اس کا حل تو یہی ہے کہ خطبات کے زیادہ سے زیادہ عام فہم تراجم کیے جائیں ان پر تبصرہ کرنے والی کتابیں لکھی جائیں اور ان کی شرحیں ہوں اور مختلف مجالس علمی میں انھیں زیرِ بحث لایا جائے۔

جب اس طرح اقبال کے خطبات ہمارا مسئلہ بنیں گے تو پھر ہم ان میں مندرج تحقیقات و تجزیوں کا جائزہ بھی لے سکیں گے اور اقبال کے بعد اب تک طبیعات، ریاضی، نفسیات وغیرہ میں جو نئی تحقیقات سامنے آ چکی ہیں اُن کی روشنی میں اقبال کے حاصل کردہ نتائج کا از سرِ نو مطالعہ کیا جا سکے گا۔

اقبال کے نتائج فکر کا از سرِ نو مطالعہ کرنے کا مطلب اقبال کی فکر پر عدم اعتماد نہیں بلکہ خود اقبال کے اس قول پر عمل ہو گا کہ ''بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و تفکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں جیسے جیسے جہانِ علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور، اور شاید ان نظریوں سے جو اِن خطبات میں پیش کئے گئے ہیں زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہ ہر حال یہ

ہے کہ فکر انسانی کے نشو ونما پر بہ احتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد وتنقید
سے کام لیتے رہیں۔" (دیباچہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ از اقبال ص ۴۰)
اور یہی ہماری دوسری گزارش بھی ہے۔

(۱۹۹۲ء)

....

یہ تحریر جیسا کہ ظاہر ہے اب سے پندرہ برس پیشتر کی ہے۔ اس تحریر کی اشاعت کے بعد
خطبات اقبال کے حوالے سے کچھ اور مساعی بھی سامنے آئی ہیں جن کے بارے میں ہم تفصیل
سے الگ اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ دیکھیے ہمارا مضمون: تشکیلِ جدید...... نئی یا پرانی در سہ ماہی اردو
ادب شمارہ ۳۲۳ دہلی: انجمن ترقی اردو ہند جنوری ۲۰۰۴ء

جہانِ دیگر

خطوطِ مشاہیر کا ایک نادر ذخیرہ

(ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم اور ان کا ذخیرۂ خطوط)

اُردو کے نام ور شاعروں پر اپنے مضامین کے مجموعے ''ولی سے اقبال تک'' کے ابتدائیہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ (۵/اپریل ۱۹۰۶ء۔۔۔۱۴/اگست ۱۹۸۶ء) نے لکھا تھا کہ:

''مدرسانہ کے لفظوں میں مجھے تعلّی کی بو آتی ہے ایک مدرس بہر حال اس زعم سے ضرور داغدار ہوتا ہے کہ وہ ایک کرسی پر ممتکن ہوتا ہے اور اس کے سامنے بنچوں پر ایک جماعت ہے جو اس کی ہر بات پر (سمجھے یا نہ سمجھے) بُزِ اخفش کی طرح سر ہلا دینے کی عادی ہے یا اس پر مجبور ہے اسی ایک مستقل حادثے نے اکثر مدرسوں کو بار ہا طالب العلمی سے محروم رکھا ہے یہ واقعہ بار ہا پیش آیا ہے کہ ایک اچھا خاصا طالب علمِ شخص مدرّسی کے چکر میں پھنس کر غور و فکر تو درکنار تازہ ترین ادبی سرگرمیوں کی واقفیت سے بھی بے نیاز ہو جاتا رہا ہے (ولی سے اقبال تک ص ۸)

یہ ایک مدرّس کا المیہ ہے جو ہر تازہ موسم میں نئے قافلوں سے ملتا اور انھیں اگلی منزلوں کی طرف رخصت کرتا ہے لیکن خود سنگِ میل کی طرح وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ یہ مکانی ثبات اکثر صورتوں میں اس ذہنی جمود کو بھی پیدا کر دیا کرتا ہے جس کی طرف مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے اشارہ کیا ہے...... لیکن اگر مدرّس محض مدرّس نہ ہو بلکہ معلّم یا مربی یا مزّکی بن جائے تو صورت حال یکسر تبدیل ہو جاتی ہے...... مدرّس لازماً طالب علم نہیں ہوتا جب کہ معلّم یا مربی اور مزّکی طلبِ علم سے بے نیاز نہیں ہو سکتے لیکن تدریس اکثر اوقات آدمی کو مدرّسِ محض بنا دیا کرتی ہے۔ کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنی طالب علمانہ حیثیت کو برقرار رکھ سکیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ انھی کم لوگوں میں تھے جنھوں نے طویل تدریسی زندگی کے باوصف طلبِ علم کے جذبے کو زندہ رکھا۔ ان کے رواں دواں قلم کے آثار جس کا کافی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے فی الواقع ایک طالبِ علمانہ زندگی گزاری وہ مسجد کی خدمت ہو یا اسسٹنٹ لائبریرین کی ذمہ داریاں، اورینٹل کالج میں لیکچرشپ کا عرصہ ہو یا اسی کالج میں صدرِ شعبہ یا پرنسپل کی حیثیت سے گزرا ہوا زمانہ، ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی شعوری زندگی کے آغاز سے لے کر اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے صدر کی حیثیت سے وفات تک ایک طالب علم رہے اور علم کی اعلیٰ ترین منزلوں پر پہنچ کر بھی عالمانہ کبر و نخوت سے دور۔

ڈاکٹر سید عبداللہ سے میری ملاقات کا امکان بہت کم تھا اس لیے کہ ان کی وفات تک میں لاہور سے دور ایک نسبتاً چھوٹے شہر کے کالج کا کم سواد طالب علم تھا لیکن اسے خوش بختی کہیے یا حسنِ اتفاق کہ اپنے سکول اور ابتدائے کالج کے زمانے ہی سے مجھے اہلِ علم سے ملاقات اور ان سے استفادے کا شوق لاحق ہو گیا تھا چنانچہ ابھی میٹرک کیے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں ایک روز ڈاکٹر سید عبداللہ سے ملاقات کے لیے لاہور چلا آیا اور اردو دائرہ

معارف اسلامیہ میں ان کے دفتر میں پہنچا، ڈاکٹر صاحب نے یہ جان کر کہ ایک طالب علم سرگودھا سے انھیں ملنے آیا ہے، بلالیا۔ میں نے اپنے ان دنوں کے ایک تحقیقی منصوبے سے متعلق بہت سے استفسارات کیے بعد میں ان کی یادداشت بھی لکھی پھر جب میری سال اول کی متعلمی کے دوران میری اولین کتاب چھپ کر شائع ہوگئی تو سید صاحب نے خورد نوازی کرتے ہوئے اس پر بہت عمدہ تبصرہ قلمبند فرمایا...... اس اثنا میں ان سے کچھ مراسلت بھی رہی۔ میرے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ سے مراسلت اور ربط وضبط افتخار کا باعث تھا۔ مجھے سید صاحب میں ان پرانے بزرگوں کی جھلک دکھائی دینے لگی جو دوسروں کے لیے درو دامن کشادہ رکھتے اور دوسروں کو بنتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ معیّن راستوں کے مسافر تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے کچھ واضح اوران مٹ نقوش چھوڑ گئے۔ زندگی میں سمت کا تعیّن کیے بغیر سفر کرنے والے لوگ اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں استعمال تو ضرور کر لیتے ہیں اور محدود دائروں میں ان کے کچھ نہ کچھ اثرات بھی ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن نتائج کے اعتبار سے ایسے لوگوں کی زندگی بڑی ہی 'لاحاصل' رہتی ہے، بخلاف اس کے وہ لوگ جو زندگی کے رنگارنگ راستوں میں سے ایک متوازن، معقول اور موزوں راستہ اختیار کر کے اسی پر اپنی صلاحیتیں آزماتے اور اسی پر اپنی جہد وعمل کے نقوش مرتسم کرتے ہیں، لوح جہاں پر زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں اور اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے بھی ایک ایسی راہِ عمل کا تعین کر دیتے ہیں جس کے نتائج و اثرات کی اہمیت اور افادیت کو وہ خود ثابت کر چکے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا شمار بھی موخرالذکر لوگوں میں ہوتا ہے انھوں نے ایک مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس پر اپنی صلاحیتیں صرف کیں، نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ سید عبداللہ

ہماری تاریخ ادب کا ایک اہم اور ناقابل فراموش حصہ بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے ۱۹۲۲ء سے لے کر (جب انھوں نے اورینٹل کالج سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا) ۱۹۸۶ء تک وہ مسلسل ادب اُردو سے منسلک رہے اس دوران وہ لیکچرر بھی رہے، پرنسپل بھی، انھوں نے کسی بھی علم کی تدریسی سطح پر اعلیٰ ترین ڈگری ڈی لٹ بھی حاصل کی، وہ پروفیسر ایمریطس بھی تھے، اکادمی ادبیات پاکستان کے بنیادی رکن، مجلس ترقی ادب کے رُکن، انجمن ترقی اردو لاہور کے ناظم، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے جنرل سیکریٹری، مقتدرہ قومی زبان کی لاہور شاخ کے مشیر رہنے کے علاوہ انھوں نے عظیم انسائیکلوپیڈیائی منصوبے دائرہ معارف اسلامیہ کی صدارت بھی کی۔ ان تمام مدارج اور حیثیتوں میں انھوں نے اُردو زبان وادب کی گراں قدر خدمت کی، ان کی تصانیف کی تعداد تیس سے متجاوز ہے، (اگر کتابچے بھی شامل کیے جائیں تو یہ تعداد چھیالیس ہو جاتی ہے) جن میں ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، سر سیّد احمد خان اور ان کے نام ور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، مباحث، تدوین نوادرالالفاظ، نقد میر، اطراف غالب، ولی سے اقبال تک، وجہی سے عبدالحق تک، اشارات تنقید، مسائل اقبال، متعلقات خطباتِ اقبال، سہل اقبال، پاکستان میں اردو کا مسئلہ، طیف غزل، طیف نثر، کلچر کا مسئلہ، پاکستان تعمیر وتعبیر، تعلیمی خطبات اور بعض دیگر اہم کتب شامل ہیں ابھی ان تصانیف کا ذکر نہیں ہو سکا جو زندہ شکلوں میں مختلف شعبوں میں قومی وادبی خدمات انجام دے رہے ہیں، میری مراد ان کے شاگردوں سے ہے جو برصغیر کے مختلف حصوں میں بڑی تعداد میں مصروفِ عمل ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

﴿۲﴾

ادب اُردو سے سید صاحب کی دل چسپی کا آغاز بیسویں صدی کے نصف اول میں ہوا جب وہ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے منسلک ہوئے۔ یونی ورسٹی اورینٹل کالج کی ملازمت سے اُردو دائرہ معارف اسلامیہ کی صدارت تک قریباً پچاس برس سید صاحب نے اُردو ادب کی مختلف جہات میں گراں قدر اضافے کیے، اپنی طویل علمی و ادبی زندگی میں اُردو ادب کے ایک طالب علم، محقق اور نقاد ہونے کی حیثیت سے اور پھر یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے استاد، پرنسپل یونی ورسٹی اورینٹل کالج اور آخر میں اُردو دائرہ معارف اسلامیہ کی صدارت کے مناصب پر فائز رہنے کے باعث برصغیر پاک و ہند اور دیگر ممالکِ شرق و غرب کے فضلا سے سید صاحب کے گہرے روابط رہے جن میں بارہا انھیں مراسلت کی ضرورت بھی پیش آئی۔

ادب اُردو کے حوالے سید صاحب کی ہمہ پہلو شخصیت، ان کے علمی مقام و مرتبے اور احترام کو پیش نظر رکھا جائے تو اس بات کا اندزہ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ انھیں کیسے کیسے اصحابِ علم و فضل سے مراسلت کا موقع ملا ہوگا اوران مراسلتوں میں کیا کیا موضوعات زیر بحث آئے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے سید صاحب اپنی تحریروں، کاغذات اور جملہ دستاویزات کو بہت اہتمام سے محفوظ رکھنے کے عادی تھے، ان کی اسی عادت کے باعث مختلف اصحاب کے ساتھ ان کی مراسلتوں کے فائل بھی موجود ہیں جن کا ذخیرہ اس وقت مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور (سید صاحب جس کے بانی اور سیکریٹری تھے) میں ڈاکٹر

وحید قریشی جیسے صاحبِ علم اور قدر شناس بزرگ کی نگرانی میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ خطوط نہایت درجہ اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور صرف یہی نہیں ان سے برصغیر پاک و ہند کی مختلف علمی شخصیات کے افکار، اسالیبِ مراسلت اور ان کی شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے میں بہت مدد ملتی ہے۔

مشاہیر کے خطوط سے دل چسپی کے باعث راقم الحروف کو اس ذخیرے کے تفصیلی مشاہدے کا موقع ملا، سید صاحب کے دیگر فائلوں اور کاغذات کا تذکرہ چھوڑتے ہوئے یہاں صرف خطوطِ مشاہیر سے متعلق ذخیرے کا مختصر تعارف کرانا مقصود ہے:۔

ذخیرے کا تعارف

خطوط کا یہ ذخیرہ بیس فائلوں پر مشتمل ہے جن میں آٹھ فائل خطوط کے ہیں، پانچ فائل ذاتی کاغذات اور مراسلات پر مشتمل ہیں جب کہ سات فائلوں میں متفرق خطوط اور ان کے جوابات شامل ہیں۔ ضخامت کے اعتبار سے بعض فائل بہت مختصر یعنی پچاس، ساٹھ کاغذات پر مشتمل ہیں جب کہ تین فائل ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک قریباً سات سو کاغذات پر مشتمل ہے۔ باقی فائل اوسط درجے کی ضخامت کے حامل ہیں۔ ان فائلوں میں بالعموم ہر طرح کے کاغذات و مراسلات ملے جلے ہیں، البتہ تین فائل ایسے بھی ہیں جن پر باقاعدہ موضوعات کا اندراج ہے اور ان میں انھی موضوعات سے متعلق کاغذات ہیں، ایسے فائلوں کا تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ معتمدِ عمومی کی ذاتی خط و کتابت

یہ وہ خط و کتابت ہے جو ڈاکٹر سید عبداللہ نے مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کے

سے ۱۹۷۳ء جولائی کا آغاز اس فائل کے ضخامت اوسط کی ۔ سے حیثیت کی سیکر ٹری

ہوتا ہے۔

۲۔ذاتی کاغذات

یہ ضخیم فائل ہے جس پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے، لیکن اس میں محفوظ کاغذات

کا زمانہ فروری ۱۹۶۸ء سے شروع ہوتا ہے۔

۳۔فائل از ۱۵؍ اگست ۱۹۷۶ء

اس میں متفرق کاغذات ہیں اور یہ بھی اوسط ضخامت کا فائل ہے۔

فائل مرتب کرنے کا اسلوب

ڈاکٹر سید عبداللہ کا ریکارڈ گو بہ کمال و تمام محفوظ ہے لیکن اس ریکارڈ کا تحفظ کسی ایک خاص اسلوب کے تحت نہیں ہے، زیر بحث فائل بھی کسی خاص طریقے سے مرتب نہیں کیے گئے۔مختلف فائلوں کی ترتیب (یا بے ترتیبی) مختلف صورتوں میں روا رکھی گئی ہے۔

بعض فائل ایسے ہیں جن میں صرف آمدہ ڈاک ہے اور اس پر سید صاحب کے مختلف ریمارکس موجود ہیں، ایسے فائل زیادہ پرانے ہیں۔

بعض فائلوں میں ہر خط کے ساتھ سید صاحب کے جوابی خط کی کاربن کاپی بھی منسلک ہے اور اصل خط پر سید صاحب کے ریمارکس بھی درج ہیں ۔ یہ ان کی آخری عمر کی مراسلت کے فائل ہیں ۔ جب وہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ کے صدر تھے۔بعض فائلوں میں ملے جلے کاغذات ہیں ،یعنی ان میں خطوط بھی ہیں، مضامین بھی، اخباری تراشے بھی (جو انھیں مکتوب نگاروں کی طرف سے بھیجے جاتے تھے)

بعض فائل خاص موضوعات سے متعلق ہیں مثلاً ایک پورا فائل اس خط و کتابت پر مشتمل ہے جو انھوں نے اپنی صاحبزادی عطیہ سید صاحبہ کے کسی مغربی ملک کی یونی ورسٹی

میں داخلے کے سلسلے میں کی۔ اس میں بیرونی ممالک کی بعض یونی ورسٹیوں کے علاوہ پاکستان کی بعض شخصیات کے خطوط شامل ہیں۔ ایسے اصحاب میں؛ پنجاب یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اجمل، حکیم محمد سعید شہید، جمیل الدین عالی اور بعض دیگر ملکی وغیر ملکی فضلا کے خطوط ہیں۔ بیرونی فضلا میں ڈاکٹر این مری شمل کا نام زیادہ نمایاں ہے۔

مکتوب نگاری کا طریقِ کار

سید صاحب مرحوم سے راقم الحروف کو بھی مراسلت وملاقات کا شرف حاصل رہا ہے، اس دوران میں نے ان کا مکتوب نگاری کا جو طریقہ دیکھا تھا اس ذخیرہ کے ملاحظے سے اس کی مزید تائید وتصدیق ہوتی ہے کہ سید صاحب بالعموم چار طریقوں سے خطوں کے جواب دیا کرتے تھے۔

اول، یہ کہ جو خط آتا اس پر مختصراً جواب لکھ دیتے جسے ان کا سیکریٹری ٹائپ کر کے ان سے دستخط کروا کر ارسال کر دیتا۔

دوم، آمدہ خط پر محض اشارۃً بعض الفاظ درج کر دیتے، مثلاً ''شکریہ ادا کر دیں''، ''اچھا سا خط لکھ دیں''۔ وغیرہ جو کوئی خاص جواب طلب بات ہوتی اس کے نیچے لائن لگا کر حاشیے پر اس کا مختصر جواب لکھ دیتے جس کے بعد ان کے سیکریٹری یا رفیق خط کے مضمون کی شکل دیتے تھے۔

سوم، بعض خاص احباب اور عزیزوں کو وہ اپنے ہاتھ سے بھی خط لکھتے جن کا کوئی ریکارڈ غالباً نہیں رکھا جاتا تھا، کیونکہ اس ذخیرے میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط کے عکس یا نقول موجود نہیں ہیں۔

چہارم، بعض خاص احباب یا بزرگوں کو ہاتھ سے پورا خط لکھ کر اسے ٹائپ کروا

لیا کرتے تھے۔ایسے خطوط کی نقول اس ذخیرے میں موجود ہیں۔

خط پر نوٹ لکھنے کا طریقِ کار

مختلف خطوط پر سید صاحب جو جوابی نوٹ لکھتے تھے ان کا طریقِ کار کچھ یوں تھا کہ خط کے بالائی حصے کی خالی جگہ یا اگر خط کے آخر میں کچھ جگہ خالی ہو تو وہاں اپنے قلم سے خط کے مطابق مختصراً اس انداز کے جملے لکھ دیا کرتے تھے کہ ''جواب طلب نہیں۔سید عبداللہ'' یا جیسے ایک عقیدت مند کے خط کے بالائی حصے پر لکھا ہے:

''اسلم قریشی صاحب (سید صاحب کے سیکریٹری، جو آج کل اورینٹل کالج کے شعبہ اردو میں سینیر سٹینوگرافر ہیں)! یہ پتوں کے رجسٹر میں درج کرلیں۔سید عبداللہ''

مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک خط کے نیچے لکھا ہے؛

''مودبانہ خط۔۔۔اب نتیجہ شائع ہوا ہے، قاعدے کی رُو سے معاوضہ نتیجہ شائع ہونے کے بعد ملا کرتا ہے، میں کوشش کروں گا کہ جلد مل جائے۔''

''مودبانہ خط'' کے الفاظ ہدایت ہیں کہ اس خط کا جواب مودبانہ انداز میں لکھا جائے اور باقی عبارت خط کے مضمون کے لیے ہے۔

اگر خط میں کوئی تحقیق طلب بات ہوتی تو اس کا نوٹ سیکریٹری صاحب کے لیے الگ لکھا کرتے تھے۔مثلاً دریابادی صاحب کے اس خط پر ایک الگ لائن لگا کر لکھا ہے؛

''جمیل! مرزا صاحب کے ذریعے پھران کے چیک کا پتا چلایئے۔''

بعض خطوط جو ان کے شاگرد، قاری یا عقیدت مند انھیں لکھتے ان پر انگریزی میں فقط "FILE" کے الفاظ درج فرمادیتے، ایسے بہت سے خطوط اس ذخیرے میں موجود ہیں، FILE کا مطلب تھا کہ اس خط کے جواب کی ضرورت نہیں۔

بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن پر کوئی نوٹ درج نہیں البتہ ان کی پیشانی پر لفظ
''جواب'' جواب دیے جانے کی تاریخ کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

کچھ خط ایسے بھی ہیں جن پر کوئی نوٹ یا نشان نہیں لگایا گیا، ایسے خطوں کی بابت
خیال ہے کہ وہ جواب سے محروم خطوط ہیں۔

راقم الحروف نے سید صاحب سے اپنی ابتدائی ملاقاتوں میں جب ایک بار یہ
پوچھا کہ آپ خط کا جواب دیتے ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا تھا کہ ''ہاں میں خط کا جواب ضرور
دیتا ہوں، میرے پاس اس کی سہولت موجود ہے''

پھر مجھے اس بات کا تجربہ بھی ہوا کہ ان کی طرف سے خط کا جواب فی الفور
ملا کرتا تھا، اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ روزانہ اپنی ڈاک دیکھتے تھے اور خط پڑھ کر اس پر
جوابی ریمارکس لکھ دیتے تھے جن کے مطابق ان کا عملہ خط کا مضمون ٹائپ کر کے ان کے
دستخطوں کے ساتھ ارسال کر دیتا تھا، البتہ ایسے خطوط جو وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ان کے
بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے کہ خط ملنے کے کئے روز بعد ان کا جواب لکھا جاتا تھا؟ اغلب
ہے کہ ایسے خطوط کا جواب دینے میں بھی وہ زیادہ تاخیر نہیں کرتے تھے کیونکہ اپنے احباب
جنھیں وہ خصوصی تعلق کی بنیاد پر اپنے دست وقلم سے خط لکھتے تھے ان کے ساتھ مراسلت کے
تسلسل سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ وہ خط کا جواب جلد از جلد دیا کرتے تھے اور یہ وہ خوبی
ہے جو اب ہمارے معاشرے میں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔

خطوط مشاہیر کی نوعیت

اس ذخیرے میں سید صاحب کے نام مختلف مشاہیر واحباب کے جو خطوط ہیں وہ
مختلف نوعیتوں کے ہیں، ان میں علمی، ادبی، انتظامی، تحقیقی، غرض مختلف النوع مباحث

شامل ہیں۔

خطوط کی ایک بڑی تعداد سید صاحب سے مضامین کی فرمائش کے حامل خطوط پر مبنی ہے۔ جن کے مکتوب نگاروں میں مختلف رسالوں کے مدیر اور ان کے معاونین شامل ہیں۔

یونی ورسٹی اور اورینٹل کالج سے وابستگی کے دور کے خطوط میں یونی ورسٹی کے مسائل ومعاملات سے متعلق بحثیں ہیں۔

بیرونِ ملک سے آنے والے خطوں میں پاکستان کی یونی ورسٹیوں، علی الخصوص پنجاب یونی ورسٹی سے متعلق استفسارات اور یہاں کے مسائل زیرِ بحث ہیں۔ بعض مصنفین کے اپنی کتابیں ارسال کرتے ہوئے، ان کے ساتھ لکھے گئے خطوط ہیں۔ کتابوں پر سید صاحب کے تبصرے پر مصنفین کے شکریہ کے خطوط ہیں۔

بعض نیاز مندوں کے بلا سبب محض جوشِ عقیدت سے لکھے گئے خطوط ہیں۔ بعض خطوط سید صاحب کی آرا سے بحث کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں، بعض خطوط میں کچھ علمی استفسارات ہیں۔

غرض یہ کہ اس نادر ذخیرہ میں متنوع موضوعات پر بوقلموں شخصیات کے رنگارنگ خطوط موجود ہیں جو صرف سید عبداللہ صاحب یا ان کے مکتوبات نگاروں ہی کی نہیں بلکہ ہمارے ادبی تناظر میں پورے معاشرے کی سوچ کا عکس مرتب کرتے ہیں۔

چند نادر خطوط

ذیل میں سید عبداللہ صاحب کے نام مختلف مشاہیر کے چند خطوط ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں، جن سے اس ذخیرے میں موجود خطوط کے موضوعات اور اس کی افادیت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی

رضا لائبریری رامپور (انڈیا)

۱۷ر جولائی ۱۹۶۶ء

صدیق مکرم و محترم! تسلیم مع التکریم

''نذرِ رحمٰن'' کا ایک نسخہ ہدیتہً ملا، اس لطف و کرم کا تہِ دل سے ممنون ہوں، ماشاء اللہ کیسی خوبصورت اور دلآویز کتاب آپ نے مرتب کر کے پیش کی ہے، ظاہر بھی تحفہء لالہ و گل ہے اور باطن بھی۔

خداوند علیم آپ کو اس سے بھی بہتر علمی کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

یوں تو کتاب کے سارے مقالے مفید اور دلچسپ ہیں مگر مجھے خصوصیت کے ساتھ آپ کا مقالہ ''خط کی کہانی'' اور صدیقی ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی صاحب کا مقالہ ''تلفظ ایرانی اور اشعار امیر خسرو'' بہت پسند آئے۔

چرٹین کے نسخے کا اندازِ خط دیکھ کر تعجب ہوا کہ تیسری صدی ہجری میں خط کوفی اتنا (صاف ستھرا؟) کیسے ہوگیا تھا، نیز قرآن پاک کو ''جامع'' کہنا اور ترقیمہ فارسی میں لکھنا بھی عجیب سی بات نظر آئی۔

تختی نمبر ۵ کے ترقیمہ میں ۴۱۲ھ ہجری درج ہے، آپ نے شاید از راہِ سہو ۴۴۶ھ لکھ دیا ہے، تختی نمبر ۷ کو آپ نے ۶۶۸ھ کا مکتوب تحریر فرمایا ہے حالانکہ اس کا خط اور گلکاری دونوں عہدِ اکبر کی معلوم ہوتی ہیں، میں نے غور کر کے دیکھا تو اس تختی کی نچلی بیل میں ''عمل نادر الزماں'' لکھا بھی ہے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ فن کار اکبر (جہاں گیری) کے زمانے کا آدمی ہے، آپ بھی مزید تحقیق فرمائیے اور مجھے نتیجے سے اطلاع دیجیے۔

تختی نمبر ۱۱ کو آپ نے ۷۶۷ھ کا نوشتہ بتایا ہے، حالانکہ اس تختی (کے) صفحہ کے اوپر ''اسلکان ناصرالدین شاہ قاچار'' لکھا ہے اور جہاں متن ختم ہوتا ہے وہاں سنہ سبع وسبعین والمائتین بعد الالف یعنی ۱۲۷۷ھ تاریخ موجود ہے علاوہ ازیں خود شان خط اور گلکاری بھی تیرھویں صدی کی غمازی کرتی ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے آپ نے مہدی بیانی کے بیان پر اعتماد فرمالیا ہے، یہ ایرانی حضرات تحقیق کو ابھی کار غیر ضروری گردانتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ

امید ہے کہ مزاجِ گرامی قرین عافیت ہوگا۔ والسلام مع الاکرام

مخلص عرشی

۲

رام پور رضا لائبریری

قلعہ رام پور (انڈیا)

۴ر ستمبر ۱۹۶۶ء

مکرمی ومحترمی، تسلیم مع التکریم

مکرمت نامے نے سرفراز کیا، میں ۱۴ر اگست کو کابل چلا گیا تھا، وہاں سے ۳۰ر کو واپس آیا تو آپ کا خط پایا، الحمدللہ کہ اب بالکل اچھا ہوں، ابھی حال میں فہرست مخطوطاتِ عربیہ کی دوسری جلد چھپ کر تیار ہوئی ہے، تیسری کی تیاری جاری ہے اور مخطوطات کی فہرست کے تقریباً تین سو صفحے طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ کی تفسیر بھی چھاپی ہے، اس کا وحید نسخہ ہمارے یہاں محفوظ تھا۔

آج کل دیوانِ جریر (مع شرح ابن حبیب بغدادی) کی تصحیح میں لگا ہوا ہوں، اس

کے علاوہ الغزالی کی کتاب المنقذ کا ایک نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ مقابلے کے لیے بمبئی کی جامع مسجد میں دوسرا نسخہ مل گیا۔ ان دونوں کی مدد سے ایک متن تیار کر رہا ہوں۔ ضروری حواشی بھی لکھتا جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ یہ ابنِ جریر کے دیوان سے پہلے تیار ہو جائے گا۔

نشوان بن سعید حمیدی صاحب شمس...... کی کتابیں تقریباً ایڈٹ کر لی ہیں، ان کے حاشیے صاف کرنا باقی ہیں، ایک کتاب علمِ عروض وقوافی پر ہے اور دوسرے الوہیت اور امامت میں اختلاف آرا پر ہے۔

دعا فرمائیے کہ یہ سارے ادھورے کام پورے کرلوں۔

مخلص عرشی

والسلام مع الاکرام

سید امتیاز علی تاج

مجلس ترقی ادب۔ ۲ کلب روڈ، لاہور

یکم/مارچ ۱۹۶۶ء

مکرمی محترمی سیّد صاحب۔ تسلیم، خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کے ہاں حیدر آباد دکن سے نایاب کتابوں کا ایک ذخیرہ آیا تھا، میرے کہنے پر انھوں نے یہ ذخیرہ کسی اور ادارہ کو ابھی نہیں دیا۔

بجٹ منظور ہونے پر میں نے کتابوں کی فہرست منگوا کر پہلے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی خدمت میں اس خیال سے بھیج دی کہ آپ صاحبزادے کی شادی کے ہنگاموں میں مصروف تھے، اب یہ فہرست واپس آگئی۔ کل شام کے عصرانے میں آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ اسے جلد دیکھ دیں گے۔ ازراہِ نوازش اپنی اوّلین فرصت میں نشان لگا کر احسان مندی کا موقع بخشیں۔ یہ بات مدِ نظر رہے کہ بجٹ میں لائبریری کتب کی خرید کے لیے پانچ

ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔ امید [ہے] کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

والسلام خاکسار

امتیاز علی تاج۔ ناظم

(۲)

مجلسِ ترقی ادب

۲۔ کلب روڈ، لاہور ۲۹ر ستمبر ۱۹۶۶ء

مکرمی محترمی سید صاحب! تسلیم۔ کتابوں کی ایک فہرست اس سے پیشتر ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ آج داؤدی صاحب کی طرف سے یہ فہرست موصول ہوئی ہے۔ اسی فہرست کی یک کاپی آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ ایک ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی خدمت میں۔ یہ اس لیے کہ دونوں حضرات آزادانہ کتابوں کے انتخاب کر سکیں اور ایک دوسرے کی رائے سے متاثر نہ ہوں۔ ازراہِ نوازش کتابوں کی فہرستیں اپنی اولین فرصت میں ملاحظہ کر کے دفتر میں اطلاع دے دیں کہ میں چپراسی بھیج کر منگوالوں۔ امید ہے کہ آپ بخریت ہوں گے۔ والسلام خاکسار

سید امتیاز علی تاج

مولانا عبدالماجد دریابادی

بسم اللہ

صدق ہفتہ وار

۹ر جون ۱۹۵۹ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

کرم گستر۔ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ سے نیاز گل ایک بار حاصل ہوا ہے، لاہور میں کسی صاحب کے ہاں سہ پہر

کی چائے پر، اور اسے بھی اب ایک مدت ہوگئی۔ سنہ غالباً ۱۹۴۲ء تھا۔

اخیر ۱۹۵۶ء میں مجھ سے آپ کی یونی ورسٹی کی طرف سے فرمائش پی ایچ۔ ڈی (اُردو) میں ممتحنی کی ہوئی، مقالہ آیا۔ دیکھا تو اپنی نگاہِ ناقص میں اس میں کچھ کچھ کسر نظر آئی، مقالہ، مقالہ نویس کو واپس کیا گیا۔ اب آخر ۵۸ء میں بیچارے نے دوبارہ لکھ کر پیش کیا، اب کی جانچ اور اپنی رپورٹ لکھ کر ۱۳؍جنوری کو رجسٹرار صاحب کی خدمت میں رجسٹری سے بھیج دیا۔

چند ہفتوں کے بعد یعنی اخیر فروری سے توقع رقم معاوضہ کی شروع ہوئی، یہاں تک کہ اب جون کا پہلا دہا ختم ہو رہا ہے۔ دفتروں کی انتظامی حالت یہاں ناگفتہ بہ ہے یہی حال وہاں بھی ہوگا۔

یاددہانی کا تقاضا کرتے سخت حجاب آرہا ہے، لیکن پھر خیال آیا کہ ممتحنی میں تقرر یقیناً آپ ہی کی تحریک پر ہوا ہوگا۔ اس لیے آپ کو مطلع کر دینے میں چنداں مضائقہ بھی نہیں ۔خدا کرے آپ ہر طرح بہ خیر و عافیت ہوں۔

والسلام   دعاگو عبدالماجد

اس خط پر مندرجہ ذیل عبارات درج ہیں:

ا۔ سید عبداللہ صاحب کے ریمارکس:

''مودبانہ خط۔ اب نتیجہ شائع ہوا ہے۔ قاعدے کی رو سے معاوضہ نتیجہ شائع ہونے کے بعد ملا کرتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد مل جائے۔''

(ii) جمیل! مرزا صاحب کے ذریعے پھر ان کے چیک کا پتہ چلایئے۔

سیکریٹری کے ریمارکس:

(i) 26-5-59، 1959/A3 سٹیٹ بنک پاکستان کو PERMISSION کے لیے لکھا گیا ابھی تک وہاں سے اجازت نہیں آئی، آنے پر بنک ڈرافٹ -/200 کا بھیجا جائے گا۔

(ii) جواب ارسال کردیا گیا ہے۔ جمیل ۱۷/۶/۵۹

ڈاکٹر وزیر آغا

۵۸۔ سول لائنز، سرگودہا

۶/ردسمبر ۶۵ء

محترمی ڈاکٹر صاحب

تسلیم و نیاز امید ہے آپ بخیرو عافیت ہوں گے۔

میں نے ابھی ابھی پاکستان ریویو میں اپنی کتاب پر آپ کا تبصرہ پڑھا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے غائر نظر سے کتاب کا مطالعہ کر کے اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس تبصرے میں آپ نے میری اس حقیر تصنیف کی تعریف میں جو ایک آدھ جملہ لکھا ہے، میں اس کی قدر کرتا ہوں یہ آپ کی کشادہ دِلی پر دال ہے۔

میری اس کتاب کے مرکزی نقطۂ نظر سے آپ متفق نہیں مجھے اس سے حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ پچھلے چند ماہ سے آپ کے مضامین کے عام لہجے کو دیکھتے ہوئے میں اس ''ردِعمل'' کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ پھر بھی چند غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے چند سطور لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

گیت کے سلسلے میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ دور جس میں ہندی گیت نے فروغ حاصل کیا تھا، اُردو شاعری کے ارتقا میں کوئی مرحلہ ہی نہیں مجھے یہ پڑھ کر سخت حیرت ہوئی کیونکہ امیر خسرو کے کلام کے واضح نمونوں کے علاوہ خود حافظ محمود شیرانی کا وہ سارا کام آپ

سول لائنز سرگودھا
۶ دسمبر ۶۵

۱۳۰ آب

۱۱/۱۲/۶۵

محترمی ڈاکٹر صاحب

تسلیم و نیاز۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے

میں نے ابھی ابھی پاکستانی ریویو میں اپنی کتاب پر آپ کا تبصرہ پڑھا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے خاصے غور سے کتاب کا مطالعہ کر کے اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس تبصرے میں آپ نے میری اس حقیر تصنیف کی تعریف بھی کی ہے اور جو کمزوریاں ہیں ان کی نشاندہی بھی کی ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ یہ آپ کی کشادہ دلی کا بیّن ثبوت ہے۔

میری اس کتاب کے مرکزی نقطۂ نظر سے آپ متفق نہیں۔ مجھے اس سے حیرت نہیں ہوئی کیونکہ پچھلے چند ماہ سے آپ کے مضامین کے عام لہجے کو دیکھتے ہوئے میں اس ردعمل کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ پھر بھی چند غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے یہ چند سطور لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

گیت کے سلسلے میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ دور جس میں ہندی گیت نے فروغ حاصل کیا تھا، اردو شاعری کے ارتقا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر بہت حیرت ہوئی کیونکہ امیر خسرو کے کلام کے واضح نمونوں کے علاوہ خود حافظ محمود شیرانی کا وہ سارا کام آپ کے سامنے تھا جو اردو شاعری کے ابتدائی ادوار کے سلسلے میں انہوں نے سرانجام دیا ہے۔ پھر خود دکنی شاعری کا زمانہ بھی ملحوظ رہے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس شاعری میں گیت کے عناصر کی فراوانی تھی تو آپ کے موقف کو تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے کے بعد (میرے نقطۂ نظر کے مطابق) گیت کا زوال نہیں ہونا چاہئے تھا بلکہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ آپ کا یہ اعتراض محض ایک غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ آپ اگر کتاب کو بغور پڑھیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ میں نے گیت اور

کے سامنے تھا، جو اُردو شاعری کے ابتدائی ادوار کے سلسلے میں انھوں نے سرانجام دیا ہے۔ پھر خود دکنی شاعری کا زمانہ بھی ملحوظ رہے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس شاعری میں گیت کے عناصر کی فراوانی تھی تو آپ کے موقف کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے کے بعد (میرے نقطہء نظر کے مطابق) گیت کا فروغ نہیں ہونا چاہیے تھا جب کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ آپ کا یہ اعتراض محض ایک غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ آپ اگر کتاب کو بغور پڑھیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ میں نے گیت اور گیت نما شاعری کو (جو سنسکرت، پالی اور جنوبی ہند کی شاعری پر مشتمل تھی) دراوڑوں اور آریائی تہذیب کے تصادم کی پیداوار قرار دیا ہے۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور آویزش اور انضمام کی فضا نے دیسی بھاشاؤں کو جنم دیا تو اِن میں ایک قدرتی اور ثقافتی تسلسل کے تحت گیت کی پرانی روایت از خود منتقل ہوتی چلی آئی۔ مسلمانوں کی آمد پر جو ثقافتی تصادم ہوا، اس نے گیت کو نہیں بلکہ غزل کو پیدا کیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ گیت ختم ہو گیا۔ بعینہٖ جیسے یہ کہنا کہ جب بعد ازاں نظم کو فروغ ملا تو غزل ختم ہو گئی، ایک بالکل غلط بات ہوگی۔ ثقافتی پس منظر میں جو چیز ایک بار جڑیں پکڑ لیتی ہے پھر کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ گیت، غزل اور نظم ...... یہ تینوں اصناف اسی لیے اُردو شاعری میں ابھی تک زندہ ہیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ گیت، غزل اور نظم نہ صرف انسانی سائکی کے تدریجی ارتقا میں تین اہم مراحل ہیں، بلکہ یہ مراحل برصغیر کے ثقافتی پس منظر کی تین تہوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ان تینوں فنون کو ورثے میں حاصل کرتا ہے اور جب شعر کہتا ہے تو اس کا مزاج اس تہہ کے خاص مزاج سے متاثر ہوتا ہے جس کے قریب کھڑے ہو کر اس نے اظہارِ ذات کیا ہے۔

غزل کے سلسلے میں میرا نظریہ بھی یہ ہے کہ اُردو غزل ایرانی اور ہندی تہذیبوں کے انضمام پر وجود میں آئی۔ میں نے اس سلسلے میں تصوف کی روایت اور ایران کے ثقافتی اور جغرافیائی پس منظر کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ آپ غالباً اُردو ادب کے صرف اسلامی پس منظر سے سروکار رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ نظریہ میرے لیے قابل قبول نہیں تھا کیونکہ میری تحقیق کے مطابق اُردو غزل درآمد کی ہوئی شے تو ہے لیکن اس کا مزاج ایرانی اور ہندی ثقافت کے میل جول سے مرتب ہوا ہے، چنانچہ خود اُردو غزل میں یہاں کی زمین اور اس کے مظاہر نے ایک نمایاں کردار سرانجام دیا ہے۔

آپ نے ایک یہ اعتراض بھی فرمایا ہے کہ میرا نقطۂ نظر، اس نظریے کی ایک شاخ ہے جو اس برصغیر کے ماضی بعید کو اہمیت دیتا ہے۔ اس بُری نیت کے ساتھ کہ اسلامی اثرات کی اہمیت کو کم کیا جائے۔ نیت کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن کوئی پُرخلوص محقق کبھی اس نیت کے ساتھ تحقیق کے میدان میں نہیں اُترتا کہ وہ ایک پہلے سے تیار کردہ تخریبی پروگرام کو عملی جامہ پہنائے گا، اگر ایسا ہو تو تحقیق کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ جب کوئی تحقیق پر اس قسم کی قدغن لگائے تو تحقیق کرنے والا پلٹ کر یہ بھی سوال کر سکتا ہے کہ ''جناب آپ نے جو ادب اور ثقافت کو ایک خاص عینک سے دیکھنے کا طریق اختیار کیا ہے اور اسے ایک نیم مذہبی تنگنائے سے گزارنے کی سعی فرمائی ہے، کہیں اس سے تحقیق کا سارا رنگ محل تو دھڑام سے نیچے نہیں آ رہے گا؟......'' آپ خود ایک محقق ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تحقیق آزاد فضا میں ہو سکتی ہے، اگر آپ بھی تحقیق کرنے والوں کی نیت پر شبہ کریں گے اور انھیں ایسی تنگنائے میں خود کو محدود کرنے کی تلقین فرمائیں گے جو اتفاق سے ان دنوں بہت مقبول

ہے اور عوام کی حمایت حاصل کر چکی ہے تو پھر اُردو تحقیق، بلکہ اُردو ادب کا خدا ہی حافظ ہے۔

ممکن ہے آپ اپنے تبصرے کے آخری جملے کی طرف اشارہ کریں جس میں آپ نے مجھ پر نظرِ کرم فرمائی ہے، تو گزارش ہے کہ وہ جملے تو ADDING PAIN TO INSULT کے مترادف ہے، اس کا ذکر بھی غیر ضروری ہے۔

میں نے یہ کتاب رواروی میں نہیں لکھی، اس میں اپنا خونِ جگر شامل کیا ہے کاش آج پطرس، تاثیر یا مولانا صلاح الدین احمد ہوتے تو مجھے اپنے کام کی داد ملتی، لیکن آج تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ بھی ادب میں نعرہ بازی کو پسند کرنے لگے ہیں، آخر زمانے کی ہوا کو دیکھ کر اپنا موقف ترتیب دینے کا یہی نظریہ مسلط ہونے والا ہے، تو میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ مناسب نہیں کہ آزاد فضا میں تحقیق اور تنقید کا کام کرنے والے اسے چھوڑ کر کوئی اور دھندا اختیار کر لیں؟ ع آج کچھ درد مرے دل میں رسوا ہوتا ہے

آپ کے خط کا منتظر ہوں!

والسلام مخلص

وزیر آغا

[نوٹ: اس خط میں زیرِ بحث کتاب اردو شاعری کا مزاج ہے، خط پر جواب ارسال کیے جانے کی تاریخ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۵ء درج ہے ۔ز۔م۔ع۔]

ڈاکٹر حمید اللہ (فرانس)

بسم اللہ

اسلام آباد

چہار شنبہ ۱۸ ربیع الانور ۱۴۰۰ ھ

4 Rue de Tournon,
75006 - Paris

باسمہ

اسلام آباد
چہار شنبہ ۱۸ / ربیع الانور ۱۴۰۰

مخدوم و محترم زاد فیضکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ توقع ہے کہ میرا جوابی عریضہ مل گیا ہوگا۔
میں یہاں گزشتہ جمعہ کو آیا اور آئندہ جمعہ کو ایک ہفتہ کے قیام کے بعد
واپس جا رہا ہوں۔

(پاریس)
پاکستانی پریس اتاشی سے معلوم ہوا کہ فرانسیسی حکومت عموماً ہر سال چند
تعلیمی وظیفے پاکستانی طلبہ کو دیتی ہے اور یہ پاکستانی وزارت تعلیم سے متعلق ہے۔
کبھی پاریس کے پاکستانی سفارت خانے سے اور کبھی اسلام آباد کے فرانسیسی
سفارت خانے سے یہ مابینی کا کام لیا جاتا ہے۔
ترجیح ان طلبہ کو دی جاتی ہے جو پہلے ہی فرانسیسی زبان سے واقف
ہوتے ہیں اور کبھی کبھار استثنائی طور پر دیگر علوم کے لیے بھی کسی کو لیا جاتا ہے۔
ان سرکاری وظائف کے سوا میرے علم میں یہاں فی الوقت کوئی اور
ایسی چیز نہیں ہے جو طلبہ کے گزر اوقات کا انتظام کرتی ہو۔

نیازمند
محمد حمید اللہ

مخدوم و محترم زاد فیضکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ توقع ہے میرا جوابی عریضہ مل گیا ہوگا۔ میں یہاں گزشتہ جمعہ کو آیا تھا اور آئندہ جمعہ کو ایک ہفتے کے قیام کے بعد واپس جا رہا ہوں، پاکستانی پریس اتاچی (پاریس) سے معلوم ہوا کہ فرانسیسی حکومت عموماً ہر سال چند تعلیمی وظیفے پاکستانی طلبہ کو دیتی ہے اور یہ پاکستانی وزارتِ تعلیم سے متعلق ہے۔ کبھی پاریس کے سفارت خانے سے اور کبھی اسلام آباد کے فرانسیسی سفارت خانے سے یہ مابینی کا کام لیا جاتا ہے۔

ترجیح ان طلبہ کو دی جاتی ہے جو بعد میں فرانسیسی زبان کے معلم بننا چاہتے ہیں اور کبھی کبھار استثنائی طور پر دیگر علوم کے لیے بھی کسی کو لیا جاتا ہے۔

ان سرکاری وظائف کے سوا میرے علم میں وہاں فی الوقت کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے جو طلبہ کے گزر اوقات کا انتظام کرتی ہو۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

ڈاکٹر این میری شمل

Cambridge, Mass. 02138 — March 8, 1980

6, Divinity Street NELC

Dear Dr. Syed Abdullah,

Thank you very much for your letters. I was happy to hear from you and to see that you are well and active as ever, and I hope and pray that your activities will go on for many many years to come.

The reason that I did not reply earlier is that in this semester I

Cambridge, Mass. o2138 — March 8, 1980
6, Divinity Street NELC

Dear Dr. Syed Abdullah,
thank you very much for your letters. I was happy to hear from you and to see that you are well and active as ever, and I hope and pray that your activities will go on for many many years to come.
The reason that I did not reply earlier is that in this semester I am barely in Cambridge; I have to give a series of lecterues (altogether some 4o) in various universities and this, along with a rather heavy teaching schedule, leaves me barely time to breathe.
I am afraid you think that the admission for your daughter, whom I remember with great pleasure is easy. I would not know how to approach a philosophy department becasue they usually have not post-doctoral fellowships. The resources of the American universities are almost dried up, and we can admit only about one tenth of the graduate students that apply. The only place of which I could think that they might be interested in having a skillfull young lady in higher studies in philosophy may be the University of New York at Binhampton, NY, where Professor Morawedge is teaching. But I do not know their rules. As a foreigner it would be practically impossible for her to get a real job becasue we have so many unemployed American academicians, and even if she could come to Harvard I would not be in a position to give her any job becasue of this situation and becasue I have no funds for a research assistant. I am very sorry to be sonagative - I spoke also with Dr. Charles Adams in McGill, but there the situation is equally bad, and I am afraid it is the same all over the country...
I feel very bad about this kind of letter, but unfortunately our lives have become quite difficult and we cannot help our friends as much as we would like to.
With my best wishes for you, your family and your work, and with regards to my old friends in Lahore,

Sincerely Yours,
Annemarie Schimmel

am barely in Cambridge; I have to give a series of lectures (altogether some 40) in various universities and this, along with a rather heavy teaching schedule, leaves me barely time to breathe.

I am afraid you think that the admission for your daughter, whom I remember with great pleasure is easy. I would not know how to approach a philosophy department because they usually have not post-doctoral fellowships. The resources of the American universities are almost dried up, and we can admit only about one tenth of the graduate students that apply. The only place of which I could think that they might be interested in having a skillful young lady in higher studies in philosophy may be the University of New York at Binhampton, NY, where Professor Morawedge is teaching. But I do not know their rules. As a foreigner it would be practically impossible for her to get a real job because we have so many unemployed American academicians, and even if she could com to Harvard I would not be in a position to give her any job because of this situation and because I have no funds for a research assistant. I am very sorry to be sonagative - I spoke also with Dr. Charles Adams in McGill, but there the situation is equally bad, and I am afraid it is the same all over the country…

I feel very bad about this kind of letter, but unfortunately our lives have become quite difficult and we cannot help our friends as much as we would like to.

With my best wishes for you, your family and your work, and with regards to my old friends in Lahore.

Sincerely Yours,

Signatured

Annemarie Schimmel

ڈاکٹر محمد اجمل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہائیڈل برگ ۸/فروری ۱۹۸۰ء

مکرمی ومحترمی ڈاکٹر صاحب

آپ کا نوازش نامہ ملا، اپنے وطن سے کوئی خط اور وہ بھی بالخصوص آپ کا خط اس سرد مہر فضا میں محبت کی حرارت بن کر آیا ہے، ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔

ہاں ہاں، آپ کی دختر فرخندہ اختر مس عطیہ سیّد مجھے خوب یاد ہیں، بہت ذہین اور قابل ہیں۔ فلسفے سے فطری شغف ہے، ایسے طالب علموں کو میں کہاں بھولتا ہوں، استاد کی زندگی کا سرمایہ یہی نوجوان تو ہیں۔

میں جنوب ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں گاہے گاہے لیکچر دیتا ہوں اقبال پر اور متعلقہ مضامین پر۔ اگر عطیہ اقبال کے فلسفے کے کسی پہلو پر کام کرنا چاہتی ہوں تو میں کوشش کروں گا کہ دخلہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں ہو جائے اور اگر وہ جرمن فلسفہ پڑھنا چاہتی ہیں تو ان کا داخلہ فلسفے کے ڈیپارٹمنٹ میں ہوسکتا ہے، اگر انھیں پی ایچ۔ڈی کرنا ہے تو میرا خیال ہے کہ اقبال یا اسلامی فلسفے کے کسی پہلو پر کام کریں تو اچھا ہے۔

یہاں کے طالب علموں کے لیے جرمن زبان جاننا بہت ضروری ہے، اس لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ ابھی سے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہو جائیں۔ یہاں آ کر بھی پہلے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہائیڈل برگ

۸ فروری ۱۹۸۰ء

مکرمی و محترمی ڈاکٹر صاحب

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ اپنے وطن سے کوئی خط، اور وہ بھی بالخصوص آپ کا خط، اس سرد مہر فضا میں محبت کی حرارت بن کر آیا ہے۔ ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔

ہماری عزیزہ، آپ کی دختر فرخندہ اختر (مس عظیمہ تسنیم) مجھے خوب یاد ہیں۔ بہت ذہین اور قابل ہیں۔ فلسفے سے فطری شغف ہے۔ ایسے طالب علموں کو میں کبھی نہیں بھولتا ہوں۔ استاد کی زندگی کا سرمایہ بھی ایسے ہی نوجوان تو ہیں

میں خوب۔ ایشیا انسٹیٹیوٹ میں گاہے گاہے لیکچر دیتا ہوں۔ اقبال پر اور متعلقہ مضامین پر۔ اگر عظیمہ اقبال کے فلسفے کے کسی پہلو پر کام کرنا چاہتی ہوں۔ تو میں کوشش کروں گا کہ ان کا داخلہ اس انسٹی ٹیوٹ میں ہو جائے۔ اور اگر وہ جرمن فلسفہ پڑھنا چاہتی ہیں تو ان کا داخلہ فلسفے کے ڈپارٹمنٹ میں ہو سکتا ہے۔ اگر انہیں پی ایچ ڈی کرنا ہے تو میرا خیال ہے کہ اقبال یا اسلامی فلسفے کے کسی پہلو پر کام کریں تو اچھا ہے۔

یہاں کے طالب علموں کے لئے جرمن زبان جاننا بہت ضروری ہے۔ اس لئے میرا مشورہ

تب یہ کہ نومبر ہی سے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہو جائیں۔ ہاں اگر بچے بھی ساتھ لیں تو
بچے صرف جرمن ہی میں پڑھ پائیں گے

داخلے کے فارم پاکستان میں جرمن سفارت خانے سے مل جائیں گے، اور ساتھ ہی
اگر آپ DAAD کے وظیفے کے لئے بھی درخواست دے دیں۔ البتہ اگر وہ وظیفہ مل جائے
تو اس سے یہاں جرمنی میں مختلف یونیورسٹیوں کی سیر اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع
بھی مل جائے گا

میں چند دنوں کے لئے انگلینڈ گیا ہوا تھا، اس لئے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ امید ہے
آپ معاف فرمائیں گے

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ یونیورسٹی کی اجازت سے، انسائیکلوپیڈیا کی مطبوعہ جلدیں
SÜDASIEN-INSTITUT کو تحفے کے طور پر بھیج سکیں، یہاں اردو کی کتابیں بہت کم ہیں
اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں کے کتب خانے میں اردو کی کتابوں میں اضافہ ہو،
اور اس کے ساتھ ہی اردو اکیڈمی کی مطبوعات بھی آ جائیں، تو یہ ایک بیش بہا اضافہ ہوگا،
اگر اس کے علاوہ کچھ معلومات (جامعہ کے داخلے کے بارے میں) مجھے میسر آئیں تو میں اگلے خط میں لکھ دوں گا،
امید ہے آپ اور آپ کی بیگم خیریت سے ہوں گے، بچوں کو بھی

سلام سمیت بیگم (

مخلص اور نیاز مند جمیل احمد

تین مہینے جرمن ہی پڑھائیں گے۔

داخلے کے فارم پاکستان میں جرمن سفارت خانے سے مل جائیں گے اور ساتھ ہی اگر وہ...... کے وظیفے کے لیے بھی درخواست دے دیں اور اگر وہ وظیفہ مل جائے تو اس سے یہاں جرمنی میں مختلف یونی ورسٹیوں کی سیر اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔

میں چند دنوں کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا، اس لیے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ یونی ورسٹی کی اجازت سے انسائیکلوپیڈیا کی مطبوعہ جلدیں SULA SIEN INSTITUTE. کو تحفے کے طور پر بھیج سکیں۔ یہاں اُردو کی کتابیں بہت کم ہیں اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں کے کتب خانے میں اُردو کی کتابوں میں اضافہ ہو اور اس کے ساتھ ہی اُردو اکیڈیمی کی مطبوعات بھی آ جائیں تو یہ ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔

اگر اس کے علاوہ کچھ معلومات (عطیہ کے داخلے کے بارے میں) مجھے میسر آئیں تو میں اگلے خط میں لکھ دوں گا۔

امید ہے کہ آپ اور آپ کی بیگم خیریت سے ہوں گے۔ عطیہ کو بھی سلام کہیے گا۔

مخلص اور نیاز مند

محمد اجمل

احمد ندیم قاسمی

رسالہ فنون

۱۷۰۔ انار کلی لاہور، مغربی پاکستان

۱۲؍ فروری ۶۶ء

مخدوم گرامی، آداب

عنایت نامہ مل گیا تھا۔ ایک بار فون کیا مگر یا آپ کا فون خراب تھا یا میرے ہی فون میں نقص تھا۔ رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے بعد "فنون" کی ترسیل کا مرحلہ درپیش رہا۔ اس سے فارغ ہوا ہوں تو یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔

آئندہ نمبر اپریل کے پہلے ہفتے میں پیش کرنے کا ارادہ ہے، سو اگر آپ مارچ کے وسط تک بھی مضمون عنایت فرما سکیں تو میں اسے بآسانی آئندہ نمبر میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں گا۔

عزت افزائی کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

مخلص ندیم

اُردو نگر کے پتے پر تازہ شمارہ بذریعہ رجسٹری بھجوا چکا ہوں، امید ہے اب تک مل چکا ہوگا۔ ندیم

محمد طفیل

ادارہ فروغِ اُردو، انارکلی لاہور

قبلہ، اگر آپ کی کوئی تحریر ہمارے حصہ میں بھی آجائے تو میں خوش ہو جاؤں گا جتنا کہ دوسرے ادبی رسالوں والے معاوضہ دیتے ہوں گے اتنا تو میں بھی دے سکوں گا۔

ان دنوں سالنامہ چھاپ رہا ہوں، اگر آپ کی طرف سے کچھ مل گیا تو ایک گونہ اطمینان ہوگا، نقوش میری کوئی ذاتی چیز نہیں، سب کا پرچہ ہے، میرا کمال صرف اتنا ہے کہ میں جیسے تیسے یہ کام کئے جا رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ آپ کا

محمد طفیل

(۱۹۹۰ء)

علامہ علاء الدین صدیقی کی شاعری

عرفی شیرازی نے حکیم اور شاعر کی آویزش میں یہ قولِ فیصل پیش کیا ہے کہ حکیم، گوہر کی خاصیت پر نظر رکھتا ہے جبکہ شاعر اس کے رنگ روپ کا شیدائی ہوتا ہے دونوں کا موردِ نگاہ ایک ہونے کے باعث عرفی کے نزدیک حکیم و شاعر کے درمیان جنگ بے سود ہے (۱)

یہ زندگی کا رنگ روپ ہی تو ہے جو دل میں سوز و گداز پیدا کرتا ہے اور سوز و گداز کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر صداقت بھی سوز سے خالی ہو تو اس میں کمی رہ جاتی ہے۔

حق اگر سوزی ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت (۲)

وہ مرحلہ عمر جب زندگی کی نگاہِ التفات لمحہ لمحہ کھل رہی ہوتی ہے انسانی طبائع کو زندگی کے حسین پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بنا کرتا ہے- اور اسی التفات سے شعر جنم لیتا ہے...... چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ آغازِ شباب میں شعروشاعری سے دلچسپی زیادہ ہوا کرتی ہے بہت سے نوجوان شعر کہنا بھی شروع کر دیتے ہیں گو شعر سب کا تعارف نہیں بنتا-

علامہ علاء الدین صدیقی (۳/ نومبر ۱۹۰۷ء --- ۲۸/ دسمبر ۱۹۷۷ء) کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جانا چاہیے، اوائلِ شباب میں شعر کی دیوی جن پر مہربان ہوئی تھی...... گو بعد ازاں وہ کوچہ شعر سے نکل گئے لیکن ابتدائے عمر کے کچھ نقوش ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شعر کی دیوی کے اس التفات کو نظر انداز نہیں کیا تھا-

صدیقی صاحب ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے ان کی جو شاعری ہم تک پہنچی ہے- اس کا زمانہ تخلیق ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک کے عرصے میں محدود ہے یہ ان کی طالبِ علمی کا زمانہ ہے- ۱۹۰۷ء سنہ ولادت کی روشنی میں یہ سترہ (۱۷) سے تیئیس (۲۳) سال کی عمر تک کی شاعری ہے جو ظاہر ہے کہ عین عنفوان شباب کا دور ہے-

اس شاعری میں وہ رنگ ڈھنگ موجود ہے جو اس عمر کی شاعری میں ہونا چاہیے تھا- ان کی اردو غزلیں جو کالج کے طرحی مشاعروں کے لیے لکھی گئیں شاعر کے غزل خوانی کی روشِ عام پر چلنے کا پتا دیتی ہیں:

پوچھا سبب ہجوم کا کہنے لگے کہ ہاں
جس شاخ پر ہو گل وہاں بلبل نہ جائے کیوں

اس شمع رو کا جلوۂ رخسار ناصحا

دیکھے اگر تو پھر ہمیں سمجھانے آئے کیوں (۳)

(جنوری ۱۹۲۷ء)

چشمِ باطن کے ہمیشہ سامنے رہتا ہے تو
کیا ہوا جو ظاہری آنکھوں سے پنہاں ہو گیا (۴)

(جنوری ۱۹۲۵ء)

یہ اشعار معمول کے مطابق ہیں، خلافِ معمول بات یہ ہے کہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ غیر معمولی مذہبی شغف کا حامل ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں ظہور پانے والے اکثر جذبات و احساسات کا تعلق مذہب، مذہبی تعلیمات اور مذہبی شخصیات سے ہے۔

صدیقی صاحب نے تین زبانوں اردو، پنجابی اور فارسی میں شاعری کی، اردو میں مذکورہ غزلیات کے علاوہ ایک دعائیہ قطعہ اور شعر، "حضرت حامد قادری" کی مدح میں ایک مسدس (جنوری ۱۹۲۵ء) اور مثنوی، خلیفہ عمر کا انصاف (۱۲/اگست ۱۹۲۵ء) شامل ہیں جبکہ پنجابی میں شیخ فرید الدین عطارؒ (ولادت ۵۱۳ھ یا ۵۴۰ھ وفات ۶۱۸ھ یا ۶۲۷ھ) کے پند نامہ (۵) کی حمد کا ترجمہ اور فارسی میں ایک دعا ایک رباعی اور سلسلۂ سہروردیہ کا شجرۂ طریقت شامل ہیں۔

عین ممکن ہے کہ انھوں نے ان تخلیقات کے علاوہ بھی کچھ کہا ہو لیکن ان کی محفوظ بیاضوں سے ہم تک یہی کچھ پہنچا ہے۔ صدیقی صاحب کا کلام ۵x۵.۳، (اول) ۶x۴ (دوم) ۷x۵.۴ (سوم) سائز کی تین مختصر بیاضوں میں محفوظ ہے جن میں متعدد مقامات پر ان۔ کے دستخط ثبت ہیں ایک غزل کے مقطعے میں تخلص انجم بھی استعمال ہوا ہے۔

نے یار مہرباں ہے نہ قسمت میں یاوری

انجم پھر ایسے حال میں مقصد بر آئے کیوں (٦)

اس شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم نظام تعلیم کے مطابق صدیقی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت عربی و فارسی کے کلاسیکی گہواروں میں ہوئی تھی، ان دونوں زبانوں اور ان کے کلاسیکی ادب کے اثرات و ثمرات صدیقی صاحب کی اس مشقِ سخن میں صاف نظر آتے ہیں۔

اس زمانے میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا آغاز شیخ مصلح الدین سعدیؒ کی کریما (٧) اور شیخ فرید الدین عطارؒ کے پند نامے جیسی کتابوں سے ہوتا تھا واقع یہ ہے کہ یہ کتابیں جنھیں طویل نظمیں کہنا چاہئے شخصیت و مزاج کی بنیادیں بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں..... صدیقی صاحب نے عطار کا پند نامہ درسی ضرورت سے پڑھا ہو گا لیکن وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کے منظوم پنجابی ترجمے کا ڈول ڈالا اور آغاز کی حمد کا پنجابی ترجمہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔

شیخ عطار کا پچاس صفحے کا یہ رسالہ حمد و نعت، نفسِ امارہ کی مخالفت خاموشی کے فوائد، اخلاص فی العمل سیرتِ پادشاہاں، حسنِ خلق، مہلکات، اہل سعادت کے اوصاف، عافیت، تواضع، درویشوں کی صحبت کے بیان، شقاوت، عافیت، مجاہداتِ نفس، فقر، خودستائی و خودرائی کے تعارف عقلا اور احمقوں کی علامات، نیکی، ذکر، خشم و غضب، دنیا کی بے ثباتی، اسبابِ زوالِ سلطنت، خوش گوار زندگی، تسلیم و رضا معرفتِ الٰہی، تقویٰ۔ صدقات، خدمت، مہمان داری، قناعت، سخاوت، علاماتِ اہلِ جنت، صبر، تجرید و تفرید، دوستی غم خواری، رحم اور غفلت جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

مشرق کی جملہ کلاسیکی تصانیف کی طرح پند نامے کا آغاز بھی حمد باری تعالیٰ

...نامہ سے ہوتا ہے جس میں اللہ جل شانہ کی عظمت و بزرگی کے ساتھ اس کے کمالات اور ہر طرح کی صورتِ حال پیدا کر دینے پر قادر ہونے کا بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں کہے گئے یہ پچیس اشعار اسلام کے تصور توحید کا تعارف ہیں۔

ان اشعار کو ترجمہ کے لیے منتخب کرنا بجائے خود شاعر کے فکر و خیال کی سمت کو واضح کر دیتا ہے۔ قارئین کرام پہلے پند نامہ سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں بعد ازاں ہم صدیقی صاحب کی بیاض سے ان کا ترجمہ پیش کریں گے:

حمد بی حد مر خدای پاک را
آنکہ ایمان داد مشت خاک را

آنکہ در آدم دمید او روح را
داد از طوفان نجات اونوح را

آنکہ فرمان کرد قہرش باد را
تا سزای کرد قومِ عاد را

آن یکی را ارّہ برسرمی کشد
دیگری راتاج برسرمی نہد

اوست سلطان ہرچہ خواہد آن کند
عالمی را دردمی ویراں کند

طرفۃ العینی جہان برہم زند
کس نمی آرد کہ آن جا دم زند

آنکہ با مرغِ ہوا ماہی دہد

بندگان را دولت وشاہی دہد

بی پدر فرزند پیدا او کند

طفل را در مہد گویا او کند

مردۂ صد سالہ را حی می کند

این بجز حق دیگری کی می کند(۸)

اب صدیقی صاحب کی بیاض سے ان اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

آکھاں حمد بے انت اُس رب تائیں بک مٹی نوں جو ایماں دیوے

حکم نال جیندے آدم روح ملیا ضرر نوح نوں نہ طوفان دیوے

جہیڑا عاد دی قوم برباد کردا جدوں ہوا نوں قہر فرمان دیوے

بدلے اگ نوں نال پھلواڑ دے جو لونیڑے نہ یار دے آن دیوے

......

اک نوں آرے تھیں چیر کے پار کردا اک نوں بخش کے تاج سلطان کردا

اور یو بادشہ کرے جو آپ چاہے دنیا پلک دے وچ ویران کردا

......

کہیڑا مار سکے دم اوس اگے جہیڑا پلک وچ دنی ویران کردا

مچھی کھان نوں دے پنچھی اڈ دے نوں عاجز بندے نوں چا سلطان کردا

......

بناں باپ دے کرے او پت پیدا جا تک وچ پنگوڑے بلاوندا اے

سیاں ورہیاں دے مرے نوں اوس باجھوں کیہڑا اہے جو فیر جواوندا اے(۹)

......

شاعر نے کس حد تک اصل متن کا ساتھ دیا ہے قارئین کرام اس تقابل سے بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں' اس ترجمے کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ پند نامہ کی اس حمد کا ترجمہ صدیقی صاحب کی دو مختلف بیاضوں میں موجود ہے سب سے چھوٹی تقطیع کی بیاض (x۵ ۳.۵) بیاض اول اور متوسط تقطیع کی بیاض' دوم (۶x۴) کے متون میں کچھ اختلافات بھی ہیں جو ترجمے پر نظر ثانی کا پتا دیتے ہیں چونکہ متوسط تقطیع کی بیاض (بیاض دوم) میں موجود ترجمہ بہتر ہے (اور اسی سے مندرجہ بالا انتخاب نقل کیا گیا ہے) اس لیے زمانی اعتبار سے اسے موخر قرار دیا جاسکتا ہے۔

سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ چھوٹی بیاض میں اشعار کا ترجمہ مصرع وار درج کیا گیا ہے۔ (۱۰) جبکہ متوسط تقطیع والی بیاض میں ایک شعر کا ترجمہ ایک مصرعے میں کیا گیا ہے۔ ہیر کی مقبول بحر میں کیا گیا ترجمہ دونوں مقامات پر ایک ہی ہے فرق اندراج کے طریق کار کا ہے۔

متنی اختلافات درج ذیل ہیں:

مٹی خاک کی جگہ بک مٹی (شعر نمبر۱) بدلے اگوں کی جگہ بدلے اگ نوں (شعر۴) جان خاک تے اک ہلکان کردا کی جگہ جان پوہلی تے اک ہلکان کردا (شعر۱۸) بچہ کی جگہ جاتک (شعر۲۱) سواں کی جگہ سیاں (شعر۲۲) وانگ اوسدے نئیں ہے ہور کوئی کی جگہ نئیں اوسدے وانگ ہے ہور کوئی (شعر۲۵) اور بہت کوکی جگہ بہتا (شعر۲۸)

پہلے متن میں پند نامہ کے تیرھویں شعر کے دو ترجمے لکھے کہتے تھے:

اویو بادشا کرے جو آپ چاہے
دنیا پلک دے وچ ویران کردا (۱۱)

اور

اوہدی بادشاہی تنی کل جائے
کہیڑا ایس دے وچ کلام کردا (۱۲)

نظر ثانی میں دوسرا ترجمہ خارج کر دیا گیا (۱۳)۔(اور اسے ہی خارج ہونا چاہیے تھا)

فارسی سے جو دلچسپی شیخ عطار کے اشعار کے پنجابی ترجمے کا سبب بنی اس کا اظہار فارسی میں شعر کہنے کی صورت میں بھی ہوا ہے' فارسی میں صدیقی صاحب کے کلام میں ایک دعا (۱۴) (۲۹/جون ۱۹۳۰ء) ایک رباعی (۱۵) اور سلسلہ سہروردیہ کا شجرہ طریقت (۱۶) ملتے ہیں۔ دعا فارسی کی مقبول بحر و آہنگ "میں بفریادم برس یارب" کی ردیف کے ساتھ غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گنہگارم' سیہ کارم بفریادم برس یارب
بجز تو کس نمی دارم' بفریادم برس یارب
کریم و کارساز (ا) ستی شہ بندہ نواز (ا) ستی
بساز از لطف خود کارم بفریارم برس یارب
تو غفار الذنوب استی تو ستار العیوب استی
من انبارِ گناہ دارم بفریادم برس یارب (۱۷)

اس دعا کے آخری چار اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب نے یہ دعا

اپنے والد فیروز الدین صاحب کی فرمائش پر انھی کی طرف سے لکھی ہے چودھویں شعر میں تو واضح طور پر بتایا گیا ہے۔

برای من نوشته است این مناجاتی علاء الدین
بدربار تو می آرم بفریادم برس یارب (۱۸)

دعا میں فیروز الدین صاحب کی دو آرزووں کا بھی تذکرہ ہے: اپنی بیگم منور (۱۹) کے لیے اولادِ نرینہ کی اور علاء الدین (شاعر) کے لیے اعلیٰ رتبے کی آرزو۔ پہلی آرزو کے بارے میں تو ہمیں علم نہیں کہ وہ کس شکل میں پوری ہوئی البتہ دوسری آرزو کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس دعا کو اللہ کے ہاں درجہ اجابت حاصل ہوا۔ اور ۱۹۳۰ء میں مشقِ سخن کرنے والا شاعر، علاء الدین انجم بڑا ہو کر علامہ علاء الدین صدیقی بنا اور اس کے سر پر ملک کی سب سے بڑی اور قدیم دانش گاہ کی ریاست کا تاج رکھا گیا۔ (۲۰)

صدیقی صاحب نے متوسط تقطیع کی بیاض (بیاض دوم) کے آغاز میں لکھا ہے کہ "اس کاپی میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بندہ علاء الدین صدیقی کا کہا ہوا ہے ابھی کسی سے درست نہیں کرایا گیا۔" دستخط

کلام کے مطالعے سے دونوں باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے...... ان کی شاعری کی حیثیت آغاز سفر کے ایک نقش کی سی ہے لیکن اس کی مدد سے ان کی بنیادی تربیت ماحول مزاج اور شخصیت کے دوسرے تشکیلی عناصر کو سمجھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆
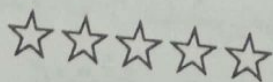
حوالے اور حواشی

۱۔ عرفی شیرازی:

تو حق بینی و من هم ای حکیم این جنگ بی سود است
تو خاصیت ز گوهر بینی و من رنگ می بینم

دیوان عرفی شیرازی بکوشش جواہری وجدی تہران: انتشارات سنائی ۱۳۶۹ ص ۲۷۴

۲۔ اقبال، علامہ ڈاکٹر محمد، پیام مشرق، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء ص ۱۰۶ء
در کلیات اقبال فارسی، فروری ۱۹۹۰ء ص ۲۷۶۔

۳۔ علامہ علاء الدین صدیقی کا کلام تین قلمی بیاضوں میں محفوظ ہے جن میں سے ایک پر ۲۵-۱۹۲۴ء اور دوسری پر ۱۹۳۰ء کے سنین درج ہیں تیسری بیاض پر کوئی سنہ مندرج نہیں تاہم قرائن سے یہ پہلی دونوں بیاضوں سے قدیم تر دکھائی دیتی ہے چنانچہ ہم اسے بیاض اول، ۲۵-۱۹۲۴ء والی بیاض کو دوم اور ۱۹۳۰ء والی بیاض کو سوم کہیں گے۔ بیاض دوم ص ۲

۴۔ بیاض دوم ص ۳

۵۔ محققین، پندنامہ کے شیخ سے انتساب میں متردد ہیں چنانچہ تقی تفضلی کے مرتبہ "دیوان عطار" میں پندنامہ شیخ کی تصانیف میں شامل نہیں۔
رک دیوان عطار، شیخ فریدالدین محمد عطار نیشابوری بہ اہتمام و تصحیح تقی تفضلی تہران: شرکت انتشارات علمی و فرہنگی ۱۳۷۴ مقدمہ ص ۲۹۔

۶۔ بیاض دوم ص ۲

۷۔ شیخ فریدالدین عطار کے پندنامہ کی طرح کریما کا سعدی کی طرف انتساب بھی مشکوک ہے۔ اور کلیات سعدی کے مستند نسخوں میں کریما شامل نہیں یہاں تک کہ علی احمد بے ستونی کے نسخے میں بھی نہیں جو سعدی کے انتقال کے محض پچاس برس بعد مرتب ہوا دیکھیے نیاز فتح پوری: "ان کتابوں کے مصنف کون ہیں" (نگار پاکستان کراچی فروری ۱۹۶۵ء ص ۷۲)۔ بحوالہ سلسلہ تنویر تصوف سہرورد ویژہ نامہ حضرت مصلح الدین سعدی شیرازی،

لاہور: سہروردیہ فاؤنڈیشن: مارچ ۱۹۹۱ء ص ۳۹ اس نظم کے اخلاقی موضوعات کے باعث بڑے پیمانے پر اسے سعدی سے منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا: " ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اس نے اس کو بھی کلیات میں داخل کر دیا ہو اور اس سبب سے کلیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو بہ ہر حال ہم جس طرح اس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں دیکھتے اس طرح اس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے" حالی، شمس العلما مولانا الطاف حسین، حیات سعدی، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۰ء ص ۸۶۔

۸۔ عطار، شیخ فرید الدین، پندنامہ محشی حاشیہ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب، ملتان، مکتبہ شرکت علمیہ س-ن ص ۳، ۴۔

۹۔ بیاض دوم ص ۵ ترجمہ حمد پندنامہ شیخ عطار دسمبر ۱۹۲۴ء

۱۰۔ بیاض اول ص اول

۱۱، ۱۲۔ بیاض اول ص ۳

۱۳۔ بیاض دوم ص ۵

۱۴۔ بیاض سوم ص اول

۱۵۔ بیاض دوم ص اول

۱۶۔ بیاض دوم ص ۱۱

۱۷۔ بیاض سوم ص ۳

۱۸۔ بیاض سوم ص ۲

۱۹۔ یہ بات کہ منور، فیروز الدین صاحب کی بیگم کا نام تھا اور فیروز الدین صدیقی صاحب کے والد کا، ہمیں محترمہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ سے معلوم ہوئی اس اطلاع کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

۲۰۔ علامہ علاء الدین صدیقی ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

(۱۹۹۷ء)

ضمیمہ

گلزارِ ابراہیم کے ترجمۂ سوز میں انتخابِ کلام

(ربط کے لیے دیکھیے: گلشنِ ہند...... ایک نامکمل اندراج کی تکمیل)

سرِ دیوان پر اپنے جو بسم اللہ میں لکھتا — بجائے مدِ بسم اللہ مدِّ آہ میں لکھتا

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا — تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا

خدایا کس کے ہم بندے کہا دیں سخت مشکل ہے — رکھے ہے ہر صنم اس دور میں دعویٰ خدائی کا

دل کے ہاتھوں بہت خراب ہوا — جل گیا، بھن گیا، کباب ہوا

یار اغیار ہو گئے اللہ — کیا زمانے کا انقلاب ہوا

سوز کو اس عذاب سے مارا — واہ وا جی بہت ثواب ہوا

جن کو نت دیکھتے تھے اب ان کا — دیکھنا بھی خیال و خواب ہوا

سوز کچھ منہ بنائے آتا ہے — آج مجرے کا پھر جواب ہوا

میں تو غبار دل کا اکبار دھو کے آیا — کوچے میں خوبرو کے کل خوب رو کے آیا

کیوں طفلِ اشک تجھ کو آنکھوں میں میں نے پالا — اس پر بھی میرے منہ پر تو گرم ہو کے آیا

منہ سے لگا ہے کاجل مسّی گلے سے چمٹی — وہ کون چلبلی تھی جس پاس سوئے آیا

یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا — نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سے کچھ باور نہیں آتا

بھرے ہیں لاکھ شکوے دل میں میرے پر مروّت سے — تمھارے روبرو تو ایک بھی منہ پر نہیں آتا

صنم کے جی میں ہیگا سوز مرجاوے تو بہتر ہے — الٰہی میں مروں کیونکر مجھے تو مر نہیں آتا

رات کو نیند ہے نہ دن کو چین — ایسے جینے سے اے خدا گذرا

یار گر صاحب وفا ہوتا — کیوں میاں جان کیا مزا ہوتا

جان کے کیا بیاں کروں احساں — یہ نہ ہوتا تو مرگیا ہوتا

سوراخ ایک ہو تو کروں اس کو بند میں — دل تو تمام خانۂ زنبور ہوگیا

غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو سنا جاؤں گا — پر مری جان ترے غم کو میں کھا جاؤں گا

مجھ سے مت جی کو لگاؤ کہ نہیں رہنے کا — میں مسافر ہوں کوئی دن کو چلاجاؤں گا

نہ رستم اس جہان میں نہ سام رہ گیا — مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

ترے دل میں بے رحم کچھ بھی نہ آیا — مجھے تو نے کس کس طرح سے ستایا

بلایا تجھے میں نے کس کس طرح سے — یہ تو اپنی ضد سے نہ آیا نہ آیا

کعبے ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا — جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کرے گا

یارب، کدھر گیا دلِ غمخوار کیا ہوا — ہر دم کی آہ سے مرا بیزار کیا ہوا

کنجِ قفس میں تو نے بسیرا لیا ہے حیف — کیوں عندلیب زار وہ گلزار کیا ہوا

آتی نہیں ہے سوز کی آواز جو سدا — کرتا تھا آہ آہ سو بیمار کیا ہوا

ہر گز نہ ہلا تیری گلی سے — مرہون ہوں جسمِ ناتواں کا

ہوا دل کو میں کہتے کہتے دوانہ — پر اس بیخبر نے کہا کچھ نہ مانا

کوئی دم تو بیٹھے رہو میرے پاس — میاں میں بھی چلتا ہوں ٹک رہ کے جانا

گیا ایک دن اس کے کوچے میں ناگہ — لگا کہنے چل بھاگ بے پھر نہ آنا

[نہ] پوچھو مجھ سے اے یاراں دماغ ان سادہ روؤں کا — سکندر کے تئیں بوجھیں ہیں ایک آئینہ دار اپنا

جتنا کوئی تجھ سے یار ہو گا — اتنا ہی خراب و خوار ہوگا

ہر روز ہو روزِ عید تو بھی — تو مجھ سے نہ ہمکنار ہوگا

افسوس تم اوروں سے ملے رات کو تنہا — ہم دن کو ترستے ہیں ملاقات کو تنہا

تو ہم سے جو ہم شراب ہوگا — عالم کا جگر کباب ہوگا

خوباں سے نہ کر محبت اے دل — آ مان کہا خراب ہو گا

ہر صبح منہ چڑھے ہے اس تند خو کے اٹھ کر — کیا آہنی کلیجہ ہے دیکھو آرسی کا

میاں تیغ نکالی ہے تو جڑ دے — ہے کس کو بھروسا ایک دم کا

نہیں ہے برق جس کو لوگ بجلی جانتے ہیں گے — جھمک جاتا ہے اس معجر کے آنچل کا کہیں کونا

سنو تو تم نے کبھی ہم کو یاد بھی نہ کیا — کبھی پیام و کتابت سے شاد بھی نہ کیا

ہمارا دل بھی صنم خانۂ قدیمی ہے — میاں سپاہی تمھوں نے جہاد بھی نہ کیا

عشق نے تیرے مجھے رسوا کیا — جو کیا صاحب بہت اچھا کیا

کیوں جھڑک دیتا ہے میری بات کو — سن تو ظالم میں نے تیرا کیا کیا

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا / مرے سوال کا تجھ سے جواب نکلے گا

غلط کہیں گے کہ شب کو گیا تھا شوخ کہیں / کہو تو راتوں کو کیا آفتاب نکلے گا

نکلے اس کے نہ بجھانے کو کسی کے آنسو / حیف صد حیف ترا سوز غریبانہ جلا

غم و شادی یہاں نہ توام ہو تو یاں گل / گریباں پھاڑ کر خنداں نہ ہوتا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر / کہ تیرا اشک جس جاگہ پڑے گلزار پیدا ہو

رات آنکھیں بند تھیں پر بخت ٹک بیدار تھا / تا سحر دل محوِ دیدارِ خیالِ یار تھا

مجھے کہتا ہے میں تجھ کو نہیں کہتا ہوں کچھ ہرگز / ہزاروں گالیاں دیتا ہے اچھا کچھ نہیں کہتا

عاشق ہوا اسیر ہوا مبتلا ہوا / کیا جانیے کہ دیکھتے ہی دل کو کیا ہوا

دل تھا بساط میں سو کوئی اس کو لے گیا / اب کیا کروں گا اے مرے اللہ کیا ہوا

ناتواں ہے دل اسے طاقت نہیں زنجیر کی / زلف کو ٹک کھول دے اے جاں ترے میں بل گیا

شہرۂ حسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا / اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

دغل نکلا جونہی معیار کے تختہ پہ کس دیکھا / بھروسا تھا بہت سا اپنی مضبوطی پہ بس دیکھا

بغیر از عاشقی کچھ کام تجھ سے ہو نہیں سکتا / تڑپنے کے سوا آرام مجھ سے ہو نہیں سکتا

وہ میرے نام سے بیزار ہیں ملنے کے کیا معنی / نہ صاحب وصل کا پیغام مجھ سے ہو نہیں سکتا

کہاں میں اور کہاں اندیشۂ بوس و کنار اس کا / نہ بھائی یہ خیالِ خام مجھ سے ہو نہیں سکتا

بتوں کے عشق سے واللہ کچھ حاصل نہیں ہوتا / انھوں سے بات بھی کرنے کو اب تو دل نہیں ہوتا

ترا جس کو ہم نے طلب گار دیکھا / اسے اپنی ہستی سے بیزار دیکھا

عجب کچھ زمانے کی ہے شکل یاراں / جو ہے کام کا اس کو بیکار دیکھا

سر اوپر شام آئی اب تلک منزل نہیں پاتا / کہاں بستر بچھاؤں میں کسی کا دل نہیں پاتا

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہوگیا / آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

یہ غضب ہے کہ چپ رہو تو کہے / نقشِ دیوار خوش نہیں آتا

اور جو کچھ کہو تو کہتا ہے / چل بے تکرار خوش نہیں آتا

ہر گھڑی چٹکیاں نہ لو صاحب / مجھ کو یہ پیار خوش نہیں آتا

نہ چھیڑو ہر گھڑی تم ہم کو اے نامہرباں صاحب / وگرنہ ہم بھی کہہ بیٹھیں گے کچھ سنتے ہو ہاں صاحب

میں کہا ایک بوسہ دو صاحب
سنتے ہی منہ پھرایا لو صاحب

کیا ہے اتنا بھی زرا منہ تو پھراؤ صاحب
لو جی ہم تم سے نہیں بولتے جاؤ صاحب

یہ وہی یار قدیمی ہے اسے پہچانو
اپنے اس سوز کو اتنا نہ بھلاؤ صاحب

کہاں تک ہجر کے ہاتھوں سے ہم نالاں رہیں یارب
جو تجھ سے بھی نہ مانگیں داد تو کس سے کہیں یارب

کبھی تو تھم رہیں اللہ آخر میں بھی انساں ہوں
یہ آنسو روز و شب آنکھوں سے کیا یوں ہی بہیں یارب

ہوا یوں دشمنِ جاں دلبر عیّار یا قسمت
یہ آنسو یوں ہوئے میرے گلے کا ہار یا قسمت

براتِ عاشقاں بر شاخ آہو سن کے ڈرتے تھے
سو دو ابرو ہوئے حق میں مرے تروار یا قسمت

ترستے ہی چلے دنیا سے ہم او بے وفا ظالم
نہ دیکھا مرتے مرتے آخری دیدار یا قسمت

مت لے مرے آگے تو دلا نامِ محبت
یہ منہ نہیں جس سے ہو سر انجامِ محبت

ہے مرگ کے مانند خمار اس کا کشندہ
میں دل سے کہا تھا کہ نہ پی جامِ محبت

نہ دکھلاوے خدا اس ناصح ناشاد کی صورت
کہ نظروں میں مرے لگتی ہے وہ جلاّد کی صورت

کبھو جو رو برو جاتا ہوں تو کہتا ہے جھنجھلا کے
پرے ہو سامنے سے سن بے او فرہاد کی صورت

چشم و ابرو کو ترے یوں دیکھ کر کہتے ہیں خلق
تُل رہے ہیں کھینچ کر آپس میں دو تروار مست

چشم سے گو اب کے آنے کا اشارہ کر گیا
بات وہ سچی نہیں جس کا کرے اقرار دوست

گو کہ صورت مرد کی ہو، مردمی کچھ اور ہے
اب تو کہلائے ہیں سارے مرد اپنے ظن کے بیچ

برق پڑیو جان پر بجلی کی میں تو جل گیا
کس سے سیکھ آئے یہ آنکھوں میں جھپک جانے کی طرح

دیکھ کر عاشق کو بیدل چھپ سے لگ جانا گلے
اے تری رندی کے کیا آتی ہے بھلانے کی طرح

یار مجھ کو قرآن کی سوگند
دل جلا تیری جان کی سوگند

ہوئی ہے عمر کہ ہم لگ رہے ہیں دامن سے
جھٹک نہ دیجیو پیارے غبار کے مانند

نہ مل ان رقیبوں سے بدنام ہوگا
میں کہتا ہوں تیری بھلائی کی خاطر

الٰہی خزانے میں تیرے کمی تھی
جو پہنچا جہاں میں گدائی کی خاطر

کیا ہے دل کو پریشان تیری زلفوں نے
لپٹ رہی ہے میاں جس ادا سے چہرے پر

اگر نہیں انھیں منظور تیرے منہ لگنا
تو پھیلتے ہیں یہ کس مدعا سے چہرے پر

شوقِ دیدار تو اتنا ہے کہ کچھ مت پوچھو
کس طرح پہنچوں مری جان نہیں میرے پر

س کے آج آنسو تو نے پونچھے
لگا ہے داغ ابتک آستیں پر

یک شگفتن دار فرصت ہے کہ جس پر بھول کر
باغ میں ہنس ہنس کے پھولی نہیں سماتی ہے بہار

گل کا چھٹکارا نہ پوچھو سوچنے کی بات ہے
چٹکیوں میں عندلیبوں کو اُڑاتی ہے بہار

دیکھتے دیکھتے دن رات بہت سے گزرے
آہ کھلتی نہیں وہ زلف گرہ گیر ہنوز

ن کے جینے کی خبر چونک کے بولا ظالم
کس قدر سخت ہے آخر نہ موا میر ہنوز

سوز آج یوں گلی سے تری کہہ کے اٹھ گیا
سو طرح تجھ کو دیکھ لیا ہم نے یار بس

کون آیا تھا چمن میں پوچھیو
آج پھرتی ہے صبا کیوں باغ باغ

مرضی جو آئے چرخ کی بیداد کی طرف
مائل کئے دل اس ستم ایجاد کی طرف

کیا کھب رہا ہے گل کے کلیجے میں خار حیف
جیتی ہے عندلیب تو اب تک ہزار حیف

منہ پہ خط آپ کے نہیں آیا
یہ مرا دودِ آہ ہے مشفق

زلف کے بٹوں میں کیا جا کردیے
یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک

ہمیشہ سوز میری آہ سے جلتا ہی رہتا ہے
الٰہی حشر کو کس منہ سے میں دوں گا جوابِ دل

نہیں ہے شبنم منہ میں پانی بھر رہا ہے شوق سے
دیکھ تیرے رو کو خمیازے پڑا کھاتا ہے گل

ناصحو دل کس کہنے ہے کس کو سمجھاتے ہو تم
کیوں دوانے ہو گئے ہو جان کیوں کھاتے ہو تم

منہ بنا میری طرف آئینہ کو بوسہ دیا
واہ وا اچھی طرح ہے زور ڈہکاتے ہو تم

لو جی اب آرام سے بیٹھے رہو جاتے ہیں ہم
پھر نہ آویں گے کبھی کاہے کو جھنجلاتے ہو تم

رات کو تم جس جگہ تھے سب مجھے معلوم ہے
جھوٹ کیوں بکتے ہو کاہے کو قسم کھاتے ہو تم

اب کاہے کو گھورتا ہے ظالم
کچھ لے کر ترا مکر گئے ہم

بس بس آنکھیں نکال مت واہ
ایسے غصے سے ڈر گئے ہم

دلِ آشفتہء عاشق ہے کہیں ، ہوش کہیں
سر کی دستار کہیں پاؤں کی پاپوش کہیں

بند میں اپنی گرہ دے کہ تجھے یاد رہے
میں یہ ڈرتا ہوں نہ ہوجائے فراموش کہیں

ہے ڈوب گیا کدھر گیا دن
کیوں شامِ فراق مر گیا دن

دیکھا تو کچھ نہ آ کے جہانِ خراب میں
کیوں زندگی خلل ہے کیا تو نے خواب میں

آرزو ہے رات دن صورت تری دیکھا کروں
پر میسر ہو نہیں سکتی ہے یارب کیا کروں

تیرے مارے ڈر کے میں چپکے بھی رو سکتا نہیں
صبر سے تو ہے خوشی سو مجھ سے ہو سکتا نہیں

غم سے روتا ہوں ولے مرتا نہیں میں کیا کروں
اشک تو بہتا ہے پر مجھ کو ڈبو سکتا نہیں

ضعف سے نالہ تو اب دل سے نکل سکتا نہیں
اشک آنکھوں میں بھرا ہے منہ پہ ڈھل سکتا نہیں

مجھ کو حیرت ہے کہ دل ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا کے آہ
مثلِ نقشِ پا ترے کوچے سے ہل سکتا نہیں

خون میں ہم ناتوانوں کے کہاں طاقت رہی
زخم تو کاری ہیں لیکن اب ابل سکتا نہیں

امیدِ وصل جز طمعِ خام کچھ نہیں
ہر صبح ہے قسم پہ قسم شام کچھ نہیں

نالہ غلط ہے مرغِ گرفتارِ دام کا
وہ تو اسیرزلف سیہ فام کچھ نہیں

لڑیں ہیں کیوں ترے مژگان وابرو یار آپس میں
اُدھر خنجر نکلتا ہے ادھر تروار آپس میں

گو کہ اے دل تجھے سرور نہیں
شاد ہونا بھی کچھ ضرور نہیں

گر ہوس تجھ کو داد خواہی ہے
کل قیامت بھی ایسی دور نہیں

کہوں اک بات میں تجھ سے اگر جی کی اماں پاؤں
مجھے قربان ہونے دے ترے قربان ہوجاؤں

آنکھیں جو نہ لگ جاتیں بیمار نہ ہوتا میں
پرہیز اگر کرتا بیمار نہ ہوتا میں

کون سا دل ہے کہ تیرا ستم آباد نہیں
کون سا روز کہ میں دست بفریاد نہیں

مسکراتا ہے کبھو رو کے ڈراتا ہے کبھو
کون سا شیوۂ بیداد اسے یاد نہیں

بندگی سے تری کچھ عار نہیں
پر میاں تو ہی وفادار نہیں

قتل کو میرے نہ کر اتنا فکر
میاں میں ایسا گنہگار نہیں

تشنہ لب کب سے ترستا ہوں پڑا
کیا ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

میں وہ درختِ خشک ہوں اس باغ میں صبا
جس کو کسی نے سبز نہ دیکھا بہار میں

یہ میں بھی سمجھوں ہوں ناصح وہ یار یار نہیں
کروں میں کیا کہ مرا دل پہ اختیار نہیں

سوز کا ملنا غنیمت جان ، مل مت غیر سے
جب ملا غیروں سے اس کی زندگانی پھر کہاں

سرو کب قابلِ نظارہ ہے تیرے ہوتے
آگے اس قامتِ رعنا کے اسے بار کہاں

دلِ محزونِ عاشق کس طرح ہو شاد دنیا میں
نجانا جن نے غیر از نالہ وفریاد دنیا میں

جسے دیکھا جہاں میں سو اسیرِ دامِ الفت ہے
مگر یہ گھر بسا ناصح رہا آزاد دنیا میں

ستمگر ، جنگجو ، ظالم وفا دشمن بہت سے تھے
تغافل کا غضب تو نے کیا ایجاد دنیا میں

کیا کروں دل کو اب قرار نہیں اس میں کچھ میرا اختیار نہیں

مجھ کو بہلاتے ہو جو وعدے پر ہاں جی ایسا بھی میں گنوار نہیں

چین کیا آوے جو دیکھے دل کی یہ بیتابیاں نیند بھی جاتی رہی سُن سُن مری بدخوابیاں

ٹیر کی خوراک ہے خوں یا کبھی لختِ جگر عشق نے تیرے تو میری ہڈیاں بھی چابیاں

برہمن کیا شیخ جو دیکھے سو سجدے کو جھکے قہر میں اے سوز الٹی پٹیاں محرابیاں

چین آتا نہیں مجھے یارب دلِ پر اضطراب کس کا ہوں

مردم تو تھک کے بیٹھے نہ آیا نظر کہیں ہاں اے سر شک لیجیو دل کی خبر کہیں

سبھی ہیں دل کے لیجانے کی باتیں سمجھتا ہوں یہ بہلانے کی باتیں

گرچہ میرے مضطرب دل کو شکیبائی نہیں پر ترا در چھوڑ کب جاؤں کہ ہرجائی نہیں

دشنام بھی لبوں سے تو ہم نے سنی نہیں بولے گا جب کے بات ابھی جی ہی جی نہیں

ناصح کا حق بظرف ہے کرنے دو وعظ و پند اس کی بھی جانے جوتی کہ اس کو لگی، نہیں

من مانتی کرتا ہے تو مجھ پر جفا میں کیا کہوں مجھ کو تو کچھ آتا نہیں غیراز دعا میں کیا کہوں

شبِ ہجراں کو تیرے عاشق کے غیر داغِ جگر چراغ نہیں

کُھب گیا حسنِ یار آنکھوں میں کیا ہی پھولی بہار آنکھوں میں

بزمِ خوباں میں سوز جا نکلا ہو گیا ان سے چار آنکھوں میں

جوں اشارہ کیا کہاں بیٹھوں بول اٹھی چشمِ یار آنکھوں میں

وعدے کیا جلد بھول جاتے ہو جھوٹے ہی روز مسکراتے ہو

ہاتھ سینے سے بس اٹھا لیجیے دردمندوں کو کیوں دکھاتے ہو

واللہ اب جو دل میں کچھ اور آرزو ہو میری یہی دعا ہے دنیا ہو اور تو ہو

شکوے تو میرے دل میں لاکھوں ہی بھر رہے ہیں یارب کہیں وہ تنہا ٹک میرے رو برو ہو

بس مت جلا مجھے سوز اللہ کرے تو مر جائے جھگڑا ہی یکطرف ہو قضیہ ہی ایک سو ہو

گزرنا گاہ میرا ہوگیا مقتل طرف یاراں کہوں کیا تم سے ہے ہے آگ لگ جاوے زمانے کو

سسکتا تھا اکیلا کوئے قاتل میں دلِ بسمل نہ تھا کچھ دیدۂ گریاں کوئی پانی چوانے کو

کیوں مشفق و مہرباں کسو کے ہم سیتی بھی آملو تو کیا ہو

دل تھا سو سوز لے گیا چھین
لو جان جو اس میں کچھ رہا ہو

وہ دن خدا کرے کہ خدا بھی جہاں نہ ہو
میں ہوں صنم ہو اور کوئی درمیاں نہ ہو

تاسرِ کوئے دلآرام مجھے پہنچا دو
یا مرے دل کو ابھی پاس سے اس کے لا دو

مغبچو اور توقع تو نہیں کچھ تم سے
سوز کی آگ تو دامن سے بھلا بھڑکا دو

ہر گھڑی گھر سے مت نکل ظالم
کوئی دیکھے تو کیا قیامت ہو

گالیاں تو لبوں سے خوب سنیں
کبھی بوسے کی تو اجازت ہو

کچھ بڑی بات تو نہیں لیکن
چوم کر لیں اگر عنایت ہو

دلبرو خط کو نہ چہرے سے ہم آغوش کرو
مجھ کو بھڑکاؤ نہ شعلے کو نہ خس پوش کرو

تجھ سیتی سن اے ظالم کوئی بھی ہے گرویدہ
دیدہ ہے سو گریاں ہے دل ہے سو ستم دیدہ

دو روز کا مہماں ہوں کیوں مجھ سے جھگڑتا ہے
جاتا ہوں ترے کو سے مت مجھ سے ہو رنجیدہ

ٹک دیکھیو اے ساقی یہ سوز نہ ہووے ہائے
روتا ہے پڑا ایسا جوں شیشہء غلطیدہ

او جانے والے اس سے تو کہیو کہ واہ واہ
کچھ بھی خبر ہے در پہ پکارے ہے داد خواہ

سچ کہیو قاصد آتا ہے وہ ماہ
الحمدلِلّٰہ الحمدلِلّٰہ

کل سیر گلشن کو جاتا تھا گلرو
میں نے کہا جان میں بھی ہوں ہمراہ

جھنجھلا کے آخر بولا ہے مجھ سے
میں کون تیں کون اے واہ اے واہ

امیدیں دل کی ساری ہی بھر پائیں ہم نے آہ
اے سوز بعد مرگ تو اب مدعا ہے یہ

دامن کشاں وہ لاش پہ آکر کہے مجھے
ہے ہے کسی کے پیچھے ترستا موا ہے یہ

مثلِ نے ہر استخواں میں درد کی آواز ہے
کچھ نہیں معلوم یا رب سوز ہے یا ساز ہے

ایک باری دھک سے ہو کر دل سے پھر نکلی نہ سانس
کس شکار انداز کا یہ تیرِ بے آواز ہے

جو تیرے قد کو دیکھے شمع پانی ہو پگھل جاوے
مجھے دیکھے اگر پروانہ اپنے جی میں جل جاوے

نہ ملیے ہم سے و لے جی سے مہرباں رہیے
خوشی سے رہیے مرے مہرباں جہاں رہیے

ستم پناہ یہ کیا ظلم ہے ادھر تو دیکھ
جو باوفا ہووے اس کے ہی بدگماں رہیے

نہ عاشق ہے کسی کا تو نہ بیتابی سے محرم ہے
میاں چل راہ لگ اپنی تجھے کیا سوز کا غم ہے

مجھ کو کیوں مبتلا کیا تو نے
اے میری جان کیا کیا تو نے

غم کے ہاتھوں مجھے ہلاک کیا
یار کیا یہ بھلا کیا تو نے

دل لے ہی گیا نہ یار ہے ہے
ہے ہے دلِ بے قرار ہے ہے

مجھ سے کہتا گلہ میرا کیا جس تس کنے
کب کیا کس جا کیا کس وقت کس دم کس کنے

مجھے کہتا ہے کب میں نے لیا دل
بہت اچھا مکر جانے کی خوبی

عاشقی کا گر یہی اسلوب ہے
تو تو اس جینے سے مرنا خوب ہے

یوں پوچھنا کہ سچ ہے فلانے کو عشق ہے
صدقے میں جان بوجھ بھلانے کو عشق ہے

دل خانۂ خدا ہے خدا لا شریک لہ
پر اس میں سوز تیرے سمانے کو عشق ہے

جو میرے عدو سے ان سے تو یار ہوا
مجھ سے لڑنے کو اب تو تیار ہوا

رہ رہ کے مرے دل میں یہی آتا ہے
اللہ تو مجھ سے ایسا بیزار ہوا
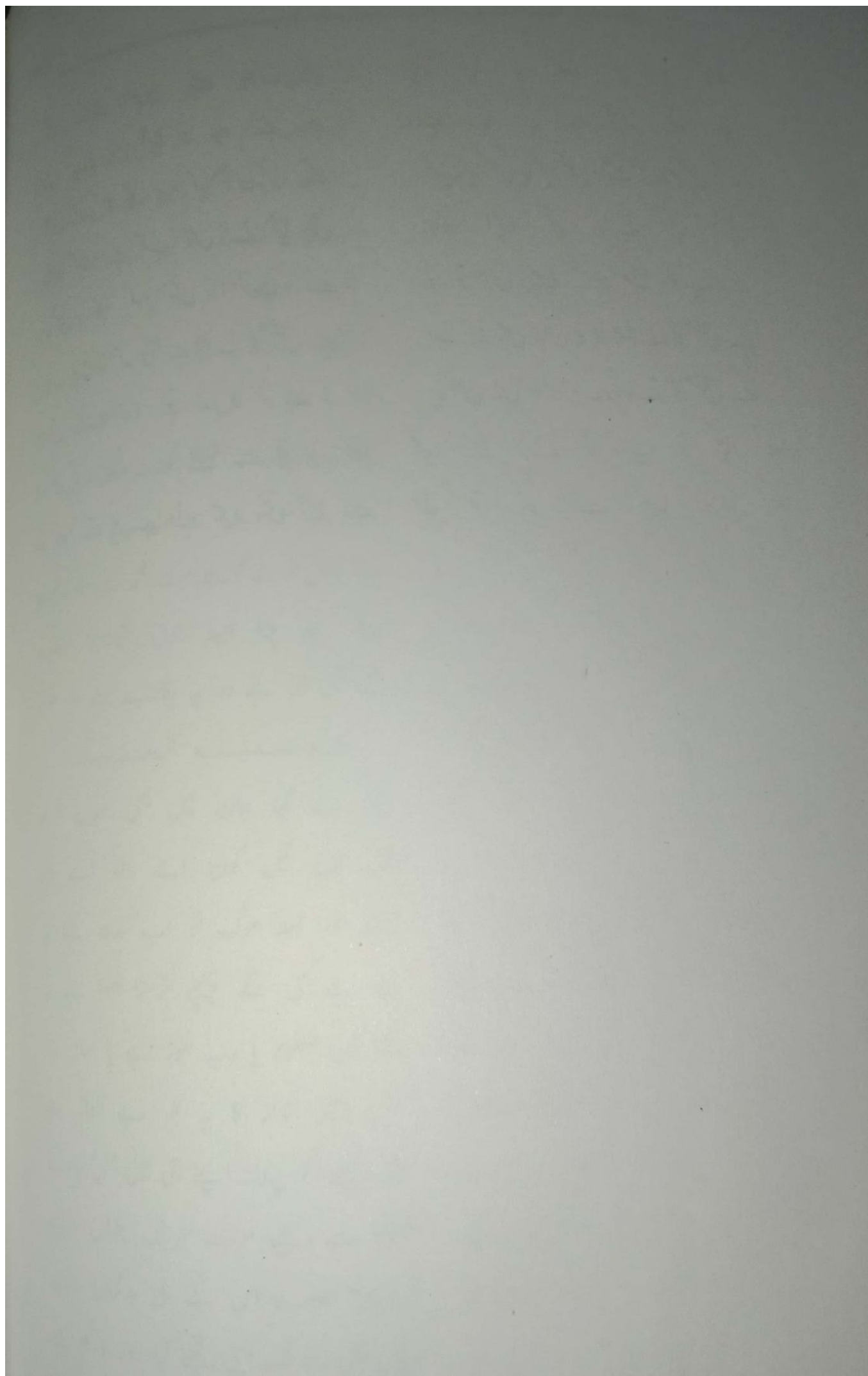
اشاریہ

ا۔ اشخاص

ب۔ ادارے

ج۔ کتب و جرائد

۱۔ اشخاص

ب ۔ ادارے

پ - کتب و جرائد

تصحیحات

شمار صفحہ	شمار سطر	نادرست اندراج	درست صورت
۴	۱۷	hand	had
۷	۸	تحقیقی مقالہ	مقالہ
۴۰	۱۳	ازحلاوتی	ازوحلاوتی
۴۳	۱۰	الرحیمن	الرحیم
۷۸	۱۱	ا۱زمت ہے	ملازمت مراد ہے
۸۹	۵	مدہ لگیر	تلامذہ دگیر
۹۳	۸	وزیرالمالک	وزیرالممالک
۹۵	۱۱	نواش	نوازش
۹۸	۴و۵	کیبجے	کیجیے
۹۸	۸	چھپ	چھب
۱۰۲	۴	تشبیہ	تشبیہ
۱۰۸	۱۷	حاصل کیا	حاصل کی
۱۲۴	۱۰،۱۳،۱۶،۱۸	رولپنڈی	راولپنڈی
۱۳۱	۸	رحمت اللعالمین	رحمۃ للعالمین
۱۵۱	۱۸	Lahore. I	Lahore, I
۱۵۳	۱۶	effects	effect
۱۷۸	۱۲	موقعہ	موقع
۲۰۷	۱۸	جستجوں	جستجو
۲۱۱	۲	نما	نماز
–	۷	متمکن	متمکن
۲۳۰	۶	ربط وضبط	ربط ضبط
۲۳۱	۷،۸	مسائلز یر۔ لکھےگیے	مسائل زیر۔ لکھے گئے
۲۳۱	۱۴	سیدعبداللہ صاحب	سیدعبداللہ صاحب
۲۳۲	۶و۷	تحفہء لالہ وگل	تحفہ لالہ وگل
۲۳۲	۱۲	پیزٹمین	چیئرمین
۲۳۲	۱۳	(صاف ستھرا)	ماثقرا
۲۳۲	۱۵	ترقیمہ	ترقیمے
۲۳۶	۱	الغزالی کی کتاب المنقذ	الفراء کی کتاب المقصور والممدود
۲۳۶	۴	حمیدی صاحب شمس	حمیری صاحب شمس العلوم
۲۳۸	۳	امتیاز علی تاج	سید امتیاز علی تاج
۲۳۸	۱۲	امید ہے کہ	امید [ہے] کہ
۲۳۸	۱۳	بخریت	بخیریت
۲۳۸	۱۹	اسلام علیکم	السلام علیکم
۲۵۰	۵	اب کی جانچ۔ بھیج دیا	اب کے جانچا۔ بھیج دی
۲۵۸	۳	جملے	جملہ
۲۵۸	۱۰	رسوا	سوا
۲۷۰	۲	محمد طفیل	محمد طفیل ۶۶-۲-۱۶
۲۷۴	۷	واقع	واقعہ
۲۷۶	۱۲	اوریو	اوبو
۲۷۷	۱۹	لکھے گئے	لکھے گئے
۲۷۸	۱۶	بفریادرم	بفریادم
۲۸۰	۱۵	۱۳۷۴ء	۱۳۷۴ش
۲۸۷	۱۴،۱۱	بنوں۔ گئے	پتوں۔ گئے

Chilchragh

(Collection of Essays)

Dr. Zahid Munir Amir

Faculty of Oriental Learnings
University of the Punjab
Lahore, Pakistan.